Title – FARIYAAD-E-DEHLI MAROOF BA INTIKHAB -E-DEHLI MURATTIBA NIZAMI BADAUNI.

Creator – Khwaja Hasan Nizami Dehelvi.

Publisher – Nizami Press (Badaun).

Date – 1931

Pages – 120

Subjects – Dehli – Tareekh – Atthara San Sattawan – Manzoom; Tareekh – Dehli – Atthara San Sattawan – Manzoom.

انقلاب دہلی
مجروح
داغ
غالب
سودا
ظفر
حالی
لال قلعہ دہلی
اُن نظموں کا مجموعہ جو دہلی کی بربادی پر لکھی گئیں
بار اول

فریادِ دہلی

معروف بہ

انقلابِ دہلی

مرتبہ

نظامی بدایونی

۱۹۳۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
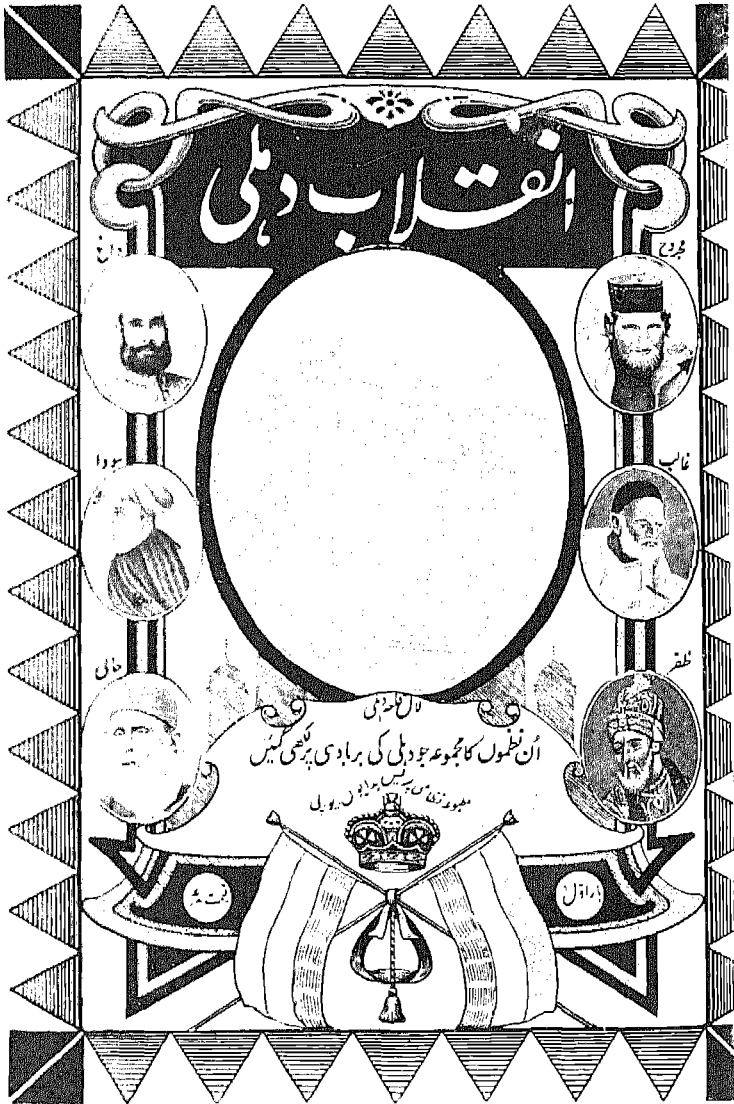
مقدمہ کتاب انقلاب دہلی

(مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے قلم سے)

تصویر حروف

یعنی

مختصر مقدمہ انقلاب دہلی

اللہ کی حمد و ثنا کے بعد بندہ کو یہ لکھنا ہے کہ جناب مولانا نظام الدین حسین نظامی ساکن بدایوں شریف اخبار ذوالقرنین کے ایڈیٹر اور مشہور و نفیس کتابوں کے شایع کرنے والے نے ایک نہایت ضروری اور مفید کتاب تیار کی ہے جس کو میں تاریخ انقلاب دہلی تصور کرتا ہوں۔

مولانا کو تاریخ سے خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے ان کے اخبار کا نام اس کی شہادت دیتا ہے۔ مگر یہ کتاب تاریخ بھی ہے۔ مرثیہ اور نوحہ بھی ہے۔ نظم و نثر کا ایک عمدہ گلدستہ بھی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ان کی تہذیب کی تصویر بھی ہے

کچھ مٹ گئی اور باقی مٹ رہی ہے۔

بدایوں اور دہلی کا تعلق ساڑھے چھ سو برس کا پُرانا تعلق ہے۔ کیونکہ بدایوں نے اپنا ایک لال (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہیؒ) دہلی کو اس وقت دیا تھا جب دہلی میں فاتح ہندوستان سلطان شہاب الدین محمد غوری کے غلام حکومت کر رہے تھے۔ اور دہلی اسلامی شہنشاہیت کا دل اور بدایوں قبۃ الاسلام تھا۔

لیکن یہ کتاب اُس زمانہ کو یاد دلاتی ہے جب غلاموں کے بعد خلجی آ چکے اور خلجیوں کے بعد تغلقوں کا زمانہ بھی ختم ہوا۔ اور سید پھر لودی بھی حکومت کر چکے اور تیمور و بابر نے مغلئی سلطنت کی بنیاد بھی ڈال لی۔ اور ان کے خاندان کا زوال بھی کمال کو پہونچ گیا۔

یعنی ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ آخری شہنشاہ دہلی کے زمانہ کی باتیں ہیں ۱۸۵۷ء کے مشہور غدر کی حکائتیں ہیں۔

یہ زمانہ مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کی تہذیب اور مسلمانوں کی ہر چیز کے ختم ہونے کا زمانہ تھا۔ اور ایسا انقلابی زمانہ تھا کہ اس کے بعد مسلمانوں کی رزم خاموش ہو گئی اور بزم کے چراغ گل ہو گئے۔ اور ان کی ہر اُمنگ تھک کر بیٹھ گئی۔

کتاب انقلاب دہلی میں طرح طرح کے خیالات اور طرح طرح کے جذبات جمع ہیں اور ان میں سے ہر چیز مٹی کا ایک موٹامر معلوم ہوتی ہے۔ موٹامر مٹی کے اس مینار کو کہتے ہیں جو کسی جگہ سے مٹی کھودنے کے بعد پیمایش کے لیے منائے سے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ یہاں سے کتنی مٹی کھد گئی۔

اس کتاب کے مضامین بھی ظاہر کرتے ہیں کہ کہاں کہاں کتنی کتنی مٹی تھی اور اب وہ کتنی کھد گئی ہے۔

میں نے غدر دہلی ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے ۱۲ حصے لکھے ہیں مگر جو عمدہ موثر لاجواب یا کمیاب چیزیں مولانا نظامی نے اس کتاب میں جمع کی ہیں ان کا میری کتابوں میں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

یہ ایک کتاب کا مقدمہ ہے۔ مقدمہ میں مدعی کی ضرورت ہے مگر کتاب "انقلاب دہلی" مدعی بھی خود ہے اور مدعا علیہ بھی آپ ہی ہے۔ اور حاکم و وکیل بھی خود ہی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک ایسی قوم اور اس کی حکومت و تہذیب کی بربادی کا ذکر ہے جس کے آج کل سب ہی مدعی و مخالف بن گئے ہیں۔ آسمان کی گردش پہلے صرف شاعروں کی مخالف تھی مگر اب وہ فقط مسلمانوں کی دشمن ہے۔

ذوالقرنین کے ایڈیٹر صاحب کو مسلمانوں کی آئندہ نسل ہمیشہ شکریہ سے یاد کرے گی کہ انھوں نے یہ بہت ہی عمدہ چیز اردو لٹریچر میں تیار کر دی۔ اگر کبھی مسلمان قوم میں کوئی اچھا انقلاب آیا تو اس قسم کی کتابوں کو اقبال کی نظموں اور حضرت اکبر الہ آبادی کے شعروں اور حسن نظامی کی نوحہ نما تحریروں کے پاس ہی جگہ دی جائے گی اور ان کو عمدہ انقلاب کا ذریعہ اور باعث قرار دیا جائے گا۔ میں نے مقدمہ لکھ تو دیا مگر یہ لکھنا مقدمہ کا لکھنا نہیں ہے بلکہ دل کی اور کلیجہ کی دبی ہوئی آہوں کو بزم کاغذ میں نمودار کرنا ہے۔

حسن نظامی

۱۵ فروری ۱۹۳۱ء۔ دہلی

۶۸۶

انقلابِ دہلی کی تمہید

(مرتب کے قلم سے)

بننا بگڑنا دہلی کی قسمت میں لکھا ہے خدا جانے وہ کتنی مرتبہ بگڑی اور کتنی دفعہ بنی تاریخ کی کتابیں تو ان انقلابات سے بھری پڑی ہیں لیکن اُردو ادب کے صفحات میں بھی ان واقعات کی جھلک نمایاں ہے۔ نادر شاہی حملے سے دہلی کی بربادی پر سوداؔ[1] نے جو مرثیہ لکھا تھا آج بھی وہ اُردو شاعری کی دنیا میں مشہور ہے۔ دہلی کے جلیل القدر بادشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے بیٹوں اعظم و معظم کی خانہ جنگی کا نوحہ جو آج سے سوا دو سو سال قبل جبکہ اُردو شاعری بلکہ اُردو زبان کی شیر خوارگی کا عالم تھا لکھا گیا تھا اور جو جعفر زٹلی[2] جیسے مشہور شاعر کے دل پر چوٹ لگنے کا نتیجہ ہے آج تک یادگار ہے۔ سب سے آخری ضرب

---

[1] سوداؔ کی تینوں نظمیں اس کتاب کے آخر میں صفحہ ۱۰۹ پر درج ہیں۔

[2] جعفر زٹلی کے اس نوحہ کے اشعار جو قدیم اُردو کا نمونہ ہیں حسب ذیل ہیں

کہاں اب پائیے اپنے شہنشاہ ٭ مکمل کامل و اکمل دل آگاہ

زکس کے افسوس گیا رونا ہے ٭ نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے

سر لٹے توپ و بندوق است ہر سو ٭ بسر اسباب صندوق است ہر سو

دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے ٭ بچہ در گود سر گٹھیا دھری ہے

کٹا کٹ و لٹا لٹ ہست ہر سو ٭ جھٹا جھٹ پھٹا پھٹ ہست چہ سو

بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است ٭ اول چال تیر خنجر کٹار است

از آں اعظم وزیں سوئے معظم

بھڑا بھڑ و دھڑا دھڑ ہر دو باہم

بچشم تا خدا از کیست راضی

بخواند نامہ بر نامِ کہ قاضی

جو دہلی کی امن پر پڑی وہ ۱۸۵۷ء کی زد تھی۔ دہلی کی یہ بربادی ایسی نہ تھی کہ اُس وقت کے شعرا خاموش بیٹھتے۔ غدر کی مصیبت جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی اُنھوں نے ان واقعات کے بیان کرنے میں خوب خوب زور قلم دکھایا ہے۔ مرزا غالب نے تو اپنے روزمرہ کے خطوط میں بھی جابجا یہی دکھڑا رویا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا" ایک خط میں فرماتے ہیں "یہاں اغنیا اور امرا کی ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے" ایک دوسرے خط میں تحریر ہے "جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی دار البقا فنا ہو جائے گا۔ رہے نام اللہ کا"

غالب نے نظم کے ذریعے سے بھی ان جذبات کا کچھ کم اظہار نہیں کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ذیل کے قطعہ بند اشعار میں بھی مرزا نے لُٹی کھسٹی دہلی کی ہو بہو تصویر کھینچی ہے ؎

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس   یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے   یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

غالب کے سوا اس عہد کے دوسرے شعرا سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ آزردہ۔ داغ حالی۔ سالک۔ افسردہ۔ شیفتہ۔ صابر۔ ظہیر۔ عیش۔ مجروح جیسے مشاہیر شعرا کے علاوہ ایسے لوگوں نے بھی بدنصیب اور اُجڑی پجڑی دہلی کے مرثیے لکھے جو شاعر ہیں جن کو شغف نہ تھا اور جن سے اس مرثیے کے سوا دوسرا کلام یادگار نہیں۔ اور تو اور تشنہ جیسے آزاد منش شاعر بھی جنھیں سچ مچ اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا اس طرح پکار اُٹھے ؎

تمام شہر تلنگوں نے آکے لوٹ لیا — مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آکے لوٹ لیا

شیفتہ نے شہر آشوب لکھنے کے علاوہ اپنے دیوان میں بھی دلی کی بربادی کا مختلف اشعار میں ذکر کیا ہے مثلاً ؎

ویرانے کی مانند کہیں دل نہیں لگتا — ہر چند کہ ہے شیفتہ دلّی وطن اپنا

[1]۱۸۵۷ء کے عبرتناک واقعہ کو تقریباً پون صدی کا عرصہ گزر چکا ہے اس لیئے آج تہتر سال کے بعد اُن تمام نظموں کو جو اس واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں جمع کرنا مشکل تھا لیکن پھر بھی چھیالیس شاعروں کی چونسٹھ نظمیں کمال جستجو سے دستیاب ہوئیں جن کو ہم نے ان اوراق میں جمع کر دیا ہے۔ یہ نظمیں شعرا کے تخلص کے لحاظ سے بہ ترتیب حروف تہجی درج کی گئی ہیں جن شعرا کا سن ولادت و وفات اور کچھ حال معلوم ہو سکا ہے وہ بھی لکھدیا ہے ان چھیالیس شاعروں میں دو ہندو شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے دہلی کے اُجڑنے کا ماتم مسلمانوں سے کم نہیں کیا ہے۔ منشی رام پرشاد ظاہر دہلی میں اسلامی سلطنت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے بادشاہان اسلام کو اس طرح روئے ہیں ؎

بارِ منت سے بھلا کس کا نہیں سر نیچا — کس کے سر پر نہیں احسانِ شہانِ دہلی

منشی رام پرشاد ظاہر نے دہلی کے شاہان اسلام کی نسبت اپنا یہ خیال جس وقت ظاہر کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ان بادشاہوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اس حکومت کا وہ چراغ بھی جو برائے نام قلعہ کے اندر ٹمٹما رہا تھا گل ہو چکا تھا اس لیئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعر نے جو کچھ کہا اُس میں خوشامد یا چاپلوسی کا شائبہ ہے بلکہ فی الحقیقت اُس نے ایک واقعہ کو نظم کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو موجودہ زمانہ کے بعض غیر مسلم مصنفین جس رنگ میں پیش کرتے ہیں اور جو رنگ ہمارے

[1] ۱۲۸۰ھ میں فغان دہلی ایک کتاب شائع ہوئی تھی جو اب نایاب ہے اس سے بہت مدد ملی۔

نوجوانوں کے قلوب کی صاف و شفاف تختیوں پر نفاق اور شقاق کے نقوش مرتسم کرتا ہی وہ حقیقت سے کوسوں دور ہی۔ ایک اور واقعہ سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہی کہ پچھلے مسلمان بادشاہوں پر جبر و تعدی وغیرہ رواداری کا جو الزام لگایا جاتا ہی وہ نہ صرف غلط ہی بلکہ حالت اُس کے برعکس تھی۔ کہا جاتا ہی کہ ۱۸۵۷ء میں فوجوں میں جب بغاوت شروع ہوئی تو ہر مذہب و ملت کے سپاہی اپنی اپنی چھاونی میں آگ لگا کر دہلی کے معزول بادشاہ ابو ظفر بہادر شاہ کی طرف دوڑ پڑے ہندو سپاہی بجائے اس کے کہ کسی ہندو راجہ کی طرف متوجہ ہوتے غریب بے بس بہادر شاہ کی جے پکارنے لگے۔

ان نظموں پر نظر ڈالنے سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہی کہ دہلی پر خون کے آنسو صرف دہلی والوں ہی نے نہیں بہائے ہیں بلکہ دوسرے مقامات کے لوگ بھی اس کی بربادی سے متاثر تھے جیسا کہ بجنور، پانی پت اور لکھنؤ کے شعراء کے قطعہ پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہی۔ لطف لکھنوی نے دہلی کے عالمگیر ماتم کا اظہار اپنے لفظوں میں اس طرح کیا ہی ؎

اُٹھ گیا لطفِ محبت نہ رہا دل کو قرار   کون ہی جس کو نہ پہونچا ہو نکانِ دہلی

دہلی والوں کے رنج و ملال کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ایک دہلوی شاعر نے شدت غم سے تنگ آکر طنزاً یہ کہہ دیا کہ دہلی مٹ گئی اچھا ہوا اور صرف اسی مضمون کو ایک مطلع میں کھپا کر چپ سادھ لی۔ فرماتے ہیں ؎

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی (راقم)

دلی کے شعرائے جہاں عزت آبرو مال دولت سلطنت حکومت محل و محلوں کی لوٹ کا رونا رویا ہی اُسی کے ساتھ اپنی زبان کی بربادی کی کچھ کم مرثیہ خوانی نہیں کی ہی

شاید ہی کوئی نوحہ ایسا نکلے گا جس میں دلّی کی پیاری زبان کے بگڑنے کا افسوس نہ کیا گیا ہو۔ ایک شاعر نے فرمایا ہے ؎

میری فریاد سے ظاہر ہے بیان دہلی
دل خوں گشتہ پہ ہے داغ زبانِ دہلی

شاطر دہلوی کا شعر ہے ؎

غدر کو تیغ نہ سمجھوں تو بھلا کیا سمجھوں
دل پہ آتا ہے نظر زخم زبانِ دہلی

ظہیر دہلوی نے کس درد سے کہا ہے ؎

رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی   اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

زبان کے ساتھ اہل علم و اہل فن کا ماتم بھی کچھ کم نہیں کیا ہے ایک مرثیہ کا شعر ہے ؎

غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے
مذاق شعر و سخن اُٹھ گیا زمانے سے

مولانا حالی نے بالکل سچ فرمایا ہے ؎

جتنے رہنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق   آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدرشناس   قدرداں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

"دنیا بامید قایم است"، فارسی کا ایک پرانا مقولہ ہے فی الواقع اُمید ہی وہ چیز ہے جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس بندھاتی ہے اُس کے خیال سے مردنی زندگی سے بدل جاتی ہے دلی کے ستم رسیدہ شعرا کو بھی مایوسی میں اُمید کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے دل سے یہ آوازیں نکلتی تھیں ؎

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دکھلا دے
الٰہی پھر اسے حسب مراد دکھلا دے

ایک فارسی نوحہ میں اس طرح دعا مانگی گئی ہے ؎

بازش از لطف و کرم آباد کن
ساکنانش را خدایا شاد کن

حکیم آغا جان عیش کا دعائیہ شعر ہے ؎

الٰہی کر دے پھر آباد باغِ دہلی کو
کر اپنے فضل سے روشن چراغِ دہلی کو

۱۹۱۱ء میں جبکہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا ان دعاؤں کی قبولیت کا وقت آیا اور انگریزی حکومت نے ہندوستان کے قدیم دار السلطنت کو چھوڑ کر کلکتہ میں جو نیا گھر بسایا تھا جارج پنجم ملک معظم کی زبان کی ایک گردش نے اس کو اجاڑ کر دلّی کو پھر بھاگ لگا دیئے۔ نئی حکومت نے نئی دہلی بسائی اور فلک نما عمارتیں لاکھوں روپیہ صرف کر کے تیار کر دیں جن کی افتتاحی رسم اسی ماہ فروری میں ادا ہوئی ہے ان عمارتوں میں نائب السلطنت گورنر جنرل ہند کے رہنے کا مکان بھی ہے۔ ہندوستان کی مرکزی مجلس وضع قوانین کا ایوان بھی ہے۔ نئی دہلی ہی میں ہندوستان کا نیا نظام حکومت جس کی بنیاد جمہوریت کے اصول پر رکھی جانے والی ہے رونما ہوگا اور نئی دہلی کی تعمیر ہندوستان کے لیے مبارک ثابت ہوگی اور نظام حکومت کا یہ نیا انقلاب اُن مصیبتوں کو جو پچھلے انقلابوں میں نازل ہو چکی ہیں بھلا دے گا

یہ ہے انقلاب دہلی کی مختصر داستان اور بس۔

خاکسار
نظامی عفی عنہ

نظامی پریس بدایوں
۱۲؍ فروری ۱۹۳۱ء

فہرست نظم ہائے مشمولہ انقلاب دہلی

آزردہ مولوی مفتی صدرالدین خاں مرحوم دہلوی

۱۸۵۷ء سے پہلے صدرالصدور تھے۔ میر ممنون دہلوی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۰۴ھ م ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶؍جولائی ۱۸۶۸ء م ۱۲۸۵ھ میں انتقال ہوا۔

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دلّی کی بھی شامت آئی

روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گو شنیدہ تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سُنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل نااہل سے خلطا انھیں زنہار نہ تھا

اُن کی خلوۃ سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا
آدمی کیا ہی فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں اُن کو کہ ڈالیں سر پر

زیورِ الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا

گو کانچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اُڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لئے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی ۔۔۔ مہندی ہاتھوں میں لگا سوتے تو کیا گھبراتی
صبح سے شام تلک نیند نہ اُن کو آتی ۔۔۔ ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی

اُن کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اُٹھایا تو سرہانے رکھا

جن کو بن دوش پہ ستارہ نہ چلتے دیکھا ۔۔۔ صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا
کبھو بیدار نہ سورج کے نکلتے دیکھا ۔۔۔ پاؤں دابے پہ بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا

وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور نالے ہیں
قدم اُٹھتا نہیں پاؤں میں پڑے چھالے ہیں

عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد ۔۔۔ لُٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہی جگر سُن کے یہ اُن کی فریاد ۔۔۔ پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھو دہلی آباد

کب تلک داغِ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم

دیکھ سکتے نہ تھے جس بات پہ وہ اڑتے تھے ۔۔۔ صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھو لڑتے تھے
پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے ۔۔۔ آنچلوں سے ترے مقیش پڑے جھڑتے تھے

اُن کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا ہی
ایک دریا ہی کہ آنکھوں سے پڑا بہتا ہی

عطر صندل میں جو دامن کو بسایا کرتے ۔۔۔ لُنٹھے موتی کے گریباں میں لگایا کرتے
بیٹھ خلوت میں جو زلفوں کو بنایا کرتے ۔۔۔ یہ سنگھار آئینے کو بھی نہ دکھایا کرتے

اب نہیں کچھ بھی اُنھیں زلفِ پریشاں کی خبر

نہ گریباں کی خبر اور نہ داماں کی خبر

روز بن ٹھن کے نکلنا وہ جوانوں کا کہاں
بیٹھنا نا نواداسے وہ دوگانوں کا کہاں

شور ہر کوچہ سے ٹپوں کی وہ تانوں کا کہاں
لطفِ ساقی کا مزا اور وہ گانوں کا کہاں

وہ مٹھی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
دھوتی بندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

شکل ایسی کہ خدا اُس کو نہ پھر دکھلاوے
اُن کی پوشاک کو گر دیکھیں تو پھر ڈ آوے

نظر آجائیں اگر وہ سرِ راہے گاہے
خون اپنا کریں یا اُن کا یہی جی چاہے

جن کے ہاتھوں سے نہ لیں پیر بھی دو کوڑی کے
چاندنی چوک میں پھرتے ہیں وہ البیلے گیلے

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفٰے خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

احسنؔ - حکیم محمد احسن خاں مرحوم دہلوی

حکیم محمد محسن خاں مرحوم دہلوی کے صاحبزادے ۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کے شاگردِ خاص تھے عنفوانِ شباب تھا کہ [illegible]ھ م [illegible]ء میں انتقال ہوا۔

ہائے وہ لوگ جو تھے روحِ روانِ دہلی
تا درِ خلد گئے کر کے گمانِ دہلی

خرمنِ صاعقہ کی ہے تجلی پیدا
بقعۂ نور ہے ہر ایک مکانِ دہلی

چاندنی چوک کو سینہ کہیں اور قلعہ کو سر
مسجدِ جامع کو ٹھہرائیں میانِ دہلی

لاشِ دہلی علم اور ہائے کا شوشہ پرچشم
اب تو باقی ہے فقط نام و نشانِ دہلی

کیا کوئی فتنہ ہے اے چرخِ ستمگر باقی
چشمِ خورشید سے کیوں ہے نگرانِ دہلی

غمِ بربادیِ دہلی میں بجائے مےِ ناب
خونِ دل پیتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

یہ محبت ہے مجھے یہاں سے کہ بعد از مردن
روزنِ قبر سے بھی ہوں نگرانِ دہلی

کیا عجب ہے کہ یہی خلد میں بولی جاوے
اہلِ جنت کی پسند آئے زبانِ دہلی

سینہ احسن کا جو چیرا تو بقولِ رضواں
دلِ خوں گشتہ پہ ہے داغِ زبانِ دہلی

ایضاً

شہر خالی شدہ از پیر و جوانِ دہلی
رفت بر باد متاعِ دل و جانِ دہلی

ایں طلسمے بود و غدر کشایندۂ آں
کس ندانست چو من سرِّ نہانِ دہلی

دلِ حسرت زدۂ من شدہ گنجِ قاروں
درہم داغِ الم داد زبانِ دہلی

بیتابِ ہر چشمِ فلکِ پیر چرا ست
بخیالست نمودارِ نشانِ دہلی

احسن خستہ جگر رفت بسوئے جنت
حوریاں را مگر آموخت زبانِ دہلی

اختر۔ مولوی ممتاز حسین مرحوم بجنوری

ہائے افسوس کہ آفت زدگانِ دہلی
جان لیتے ہیں جو کرتے ہیں بیانِ دہلی

خلد کے نام کو اب چاہیئے دہلی لکھیں
جا بسے جبکہ وہاں سارے سرانِ دہلی

کیا فصاحت کا کھول حال کسی سے نہ سنی
عرش سے فرش تلک مثل زبانِ دہلی

دین شایع تھا یہاں تک کہ صنم خانوں میں
ورد میں توحید سناتے تھے بتانِ دہلی

اے فلک یہ بھی ہے انصاف کوئی نا انصاف
شہرہ ویرانہ ہو اب نام و نشانِ دہلی

قدسیوں کو نہیں آرام کہ تا روزِ جزا
عرش پر جائے گی ہر لحظہ فغانِ دہلی

فیضِ خواجہ سے وہی نزدِ خدا عزت ہے
گرچہ ظاہر میں گئی عزت و شانِ دہلی

آلِ فرعون کے جوں ظلم سے آلِ موسیٰ
ایسے بیکس ہوئے افسوس کسانِ دہلی

نہ رہا کوئی کیا ایسا فلک نے برباد
خضر و الیاس ہیں اب فاتحہ خوانِ دہلی

جس کو رضواں نے کئی بار خدا سے چاہا
تھا وہ دُنیا میں بلاریب مکانِ دہلی

یا خدا تو ہی ملک بھیج کہ آباد کریں
کوئی باقی نہیں اب مرتبہ دانِ دہلی

شکر ایزد کہ رہی مسجدِ جامع قایم
اب توقع ہے کہ یہ بچ گئی جانِ دہلی

کونسا غنچۂ دل تھا کہ نہ پژمردہ ہوا
ہند میں ایسی چلی بادِ خزانِ دہلی

یہ خداداد تھی وہاں عقل کہ ہنگامِ جدا
شیر پر ہوتے تھے اسوار شہانِ دہلی

اب بھی ایسے ہیں کہ ذکر پائے فلاطوں ان سے
کوئی آ جائے اگر ہیچ دانِ دہلی

ہیچ تدبیر ہے تقدیر کے آگے ورنہ
کیسے کیسے تھے ذکی پیر و جوانِ دہلی

چل بسے ملکِ عدم کو کوئی باقی نہ رہا
ولے بر جور فلک فیض رسانِ دہلی

آج اس باغ میں ہر جا پہ ہیں اشجارِ زقوم
ظل افگن تھے جہاں سروِ چمانِ دہلی

جانِ اخترؔ کی طرح بے سر و سامان رہی
لے گیا کون خدا تاب و توانِ دہلی

احمد۔ میر شاہجہاں صاحب دہلوی

حیف برباد ہوئی شوکت و شانِ دہلی
ہاں مگر نام کو باقی ہے نشانِ دہلی

کیا ہم تجھ پہ پڑی سچ تو بتا پیرِ فلک
تو نے چُن چُن کے بلائے جو جوانِ دہلی

کیوں نہ پوچھیں کہ یہ آذر نے بنائے تو نہیں
دستِ قدرت نے تراشے ہیں بتانِ دہلی

کیوں چھپا پردۂ ظلمات میں آبِ حیواں
اُس نے دیکھا تھا مگر آبِ روانِ دہلی

ذکر وہ آکے سُنے خلد کا تم سے واعظ
جس نے دلی میں نہ دیکھے ہوں مکانِ دہلی

حشر میں حضرتِ باری کو بھی ہوگا افسوس
جبکہ پہنچینگے وہاں مرثیہ خوانِ دہلی

اہلِ پورب کو غزل تم نہ سُنانا احمد
سیکھ جائیں نہ کہیں طرزِ زبانِ دہلی

افسردہ۔ قاضی فضل حسین خاں مرحوم دہلوی

قاضی علی جان مرحوم رئیس دہلی کے صاحبزادے تھے۔ اس شہر آشوب کے سوا ان کے کلام کا پتہ نہیں چلتا۔ سنہ وفات معلوم نہوا۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ۱۸۵۷ء یا اس کے قریب جب یہ نظم لکھی گئی زندہ تھے۔

ہر طرف سے ہے برستی بیکسی
رات دن کا ہو گیا رونا ہنسی

ہے ہجومِ درد و غم اور بے بسی
موت کو سمجھا ہوں اب مطلب رسی

اے کہ از وضع تو چرخ انگارۂ
دردِ بے درمانِ مارا چارۂ

ایک تو اندیشۂ روزِ جزا
اک غمِ بربادیِ عالم سوا

اور پھر رنج اپنے مال و جان کا | یارب اس طوفان سے تو ہی بچا

ہم تو لئے اینجا و آنجا داورس
من ندارم در دو عالم جز تو کس

ہائے کیا دہلی پہ آفت آگئی | چین سے بیٹھے تھے شامت آگئی
سر پہ عالم کے مصیبت آگئی | فوج کیا آئی قیامت آگئی

وقتِ تنگ آمد ترحم یا رحیم
لطف کن بر دردمندانِ سقیم

تھی یہ دہلی رشکِ گلزارِ ارم | خاک سے تھا جس کی بنا جامِ جم
ہوگئی برباد و ویراں ہے ستم | ہے یہ وہ غم جس پہ خود رو دیوے غم

بازش از لطف و کرم آباد کن
ساکنانش را خدایا شاد کن

آشنائے قلزمِ عیش و طرب | ہوگئے سب غرقِ دریائے تعب
جوششِ گریہ ہے جوشِ خندہ لب | چشمِ تر ہے جوں حبابِ بحرِ آب

از کجا ایں سیلِ آفت در رسید
کاینچنیں چشمِ فلک طوفاں ندید

بانٹتے تھے رات دن جو سیم و زر | پھینکتے تھے کوڑیوں کی جا گہر
مانگتے پھرتے ہیں اب وہ در بدر | رکھتے ہیں جائے درم داغِ جگر

الکرم العفو اے ربّ العلا
از طفیلِ حضرتِ خیر الوریٰ

جن کو گھر بیٹھے تماشے تھے ہزار — پھرتے ہیں وہ دربدر رسوا و خوار
عیش و عشرت تھا جنھیں لیل و نہار — یوں خزاں اب ہو گئی اُن کی بہار

عفو کن گر جرمے از کس سر زند
یارب آں کن کاں بقوت سے سزد

داغِ غم سینے پہ کھائے بیٹھے ہیں — فکر میں سر کو جھکائے بیٹھے ہیں
تھا جو سرمایہ لٹائے بیٹھے ہیں — ہاتھ دُنیا سے اُٹھائے بیٹھے ہیں

رحم کن بر بیکساں ای دادرس
آہ از دل بر لب آید ہر نفس

کی خدا نے یہ دُعا بارے قبول — ہو گیا کافور ایک ایک بوالفضول
یعنی پھر حکامِ عادل کا نزول — ہو گیا تسکینِ دلہائے ملول

کرد ہر کس شکر رب العالمیں
شد رہا از بندِ غم جانِ حزیں

پھر گیا پھر آسمانِ پُر جفا — مخبروں نے کر دیے فتنے بپا
بے گنہ اور باگنہ پکڑا گیا — جس کی جو قسمت میں لکھا تھا ہوا

نیست شکوہ از سپہرِ کینہ جو
انچہ در تقدیر بود آمد برو

اور اپنے فتنوں سے جو ڈرتے تھے — دمبدم توبہ کا وہ دم بھرتے تھے
پاس و حفظِ آبرو کو مرتے تھے — عمر کے دن اپنے پورے کرتے تھے

پادشاہا لطف کن بر ایں کساں

ہم بحفظ و فضلِ خود بخشی اماں

مدتوں کے بعد پھر فتنہ مٹا — قید سے چھوٹے اسیرانِ بلا
اب اُسے حاکم سے ملتی ہے سزا — جو ستاتا ہے کسی کو بے خطا

ایمن وہ ای داورِ روزِ جزا
پُر جفا را کن اسیرِ صد جفا

ابرِ حسرت دل پہ اپنے چھا گیا — یہاں تو حسرت کو بھی رونا آگیا
ہائے قاضی اپنا پھانسی پا گیا — عمر بھر افسردہ کو رُلوا گیا

آنچہ برمن کرد چرخِ بدنہاد
ایچنیں اندوہ کافر را مباد

مجھسا دُنیا میں نہیں اندوہ گیں — شغل کوئی مجھ کو جز ماتم نہیں
جانِ سنگیں رکھتا ہوں دل آہنیں — ورنہ مرجاتا تڑپ کر بالیقیں

یا الٰہی لطف کن بر حالِ ما
رحمتِ خود بیں مبیں اعمالِ ما

غیرتِ باغِ جناں یہ شہر تھا — یک بیک برباد جو ایسا ہوا
انتقامِ عیش و عشرت ہو چکا — اب یہ ہے ہر شخص کی ہر دم دُعا

لطف کن بر اہلِ دہلی ای خدا
تا کہ باشد آب و آتش را بقا

دل کو افسردہ کے خوش کر ای خدا — رات دن یہ رنج میں ہے مبتلا
درپئے ایذا ہیں حاسد جا بجا — دامِ مکر و کید سے اُن کے بچا

ہر بلائے صعب از وے دور دار
دشمنش را از غضب مقہور دار

اکرام، حکیم محمد مرزا خاں مرحوم دہلوی

پوچھ مت حالِ زیانِ دہلی
ہائے ہیں اور بیانِ دہلی

ابتو نکلا تیرا ای چرخ غبار
مل گئی خاک ہیں شانِ دہلی

دولتِ حسن کو غم نے لوٹا
چھپ گئے سیمبرانِ دہلی

بن کہے چہرہ کہے دیتا ہے
بیکسی ہائے کسانِ دہلی

خاک میں مل گئے الماسِ ہنر
کھود کر دیکھ تو کانِ دہلی

یہ بھی ویسا ہی ہوا چاہتا ہے
جیسے پہلا ہے نشانِ دہلی[1]

ابتو جز حسرت و افسوس و الم
کوئی آتا نہیں مہمانِ دہلی

گریہ کی سیل ہے یہ نہر نہیں
روتے ہیں پیر و جوانِ دہلی

نہ وہ صورت ہے نہ وہ زینت ہے
غدر تھا آفتِ جانِ دہلی

نام سے اس کے ہے ایک جز و آباد
اب ہے ویران جہانِ دہلی

فرطِ بارش نے گرائے اکرام
کچھ جو باقی تھے مکانِ دہلی

تحمل، حکیم تحمل حسین خاں مرحوم دہلوی

خلف ممتاز الدولہ نواب غلام رسول خاں۔ آغا جان عیش کے شاگرد تھے ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء پچاس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

[1] پرانی دہلی کی طرف اشارہ ہے۔

صرف اک نام کو باقی ہے نشانِ دہلی
نہ وہ رفعت ہے نہ شوکت ہے نہ نشانِ دہلی

ہفت اقلیم میں اس شہر کی تھی دھاک بڑی
کوئی دنیا میں نہ تھا شہر بشانِ دہلی

ہر گلی کوچہ تھا اس شہر کا صد رشکِ ارم
غیرتِ خلد تھا ہر ایک مکانِ دہلی

سڑکیں وہ پاک کہ ہوں عارضِ خوبانِ محجوب
صاف جوں آئینہ ہر ایک دکانِ دہلی

غیرتِ چشمۂ حیواں تھا ہر اک چشمۂ آب
رشکِ تسنیم تھی ہر نہرِ روانِ دہلی

گرچہ اب خاک سی اُڑتی ہے ولے اس پہ بھی
رو کشِ بادِ بہاری ہے خزانِ دہلی

چھین لیتے تھے بس اک نیم نگہ میں دل کو
آفتِ جان تھے وہ آفتِ جانِ دہلی

وہ ہنرمند کہاں اور کہاں اہلِ کمال
اُن کے مٹنے سے مٹی شوکت و شانِ دہلی

کون ایسا ہے کہ جس پر نہیں صدمہ اس کا
جگرِ ماہ پہ ہے داغِ زیانِ دہلی

ہائے رے حسرتِ دیدار کہ خارج شدگاں
گھڑیاں سر پہ ہیں اور ہیں نگرانِ دہلی

وہ گلِ اندام جو پھولوں میں پڑے تلتے تھے
ہوئے پامالِ خزاں آہ بسانِ دہلی

نہ وہ گانا نہ بجانا نہ وہ میلے ٹھیلے
اہلِ عشرت بنے سب مرثیہ خوانِ دہلی

سینہ کوبی ہے کبھی اور کبھی آہ و فغاں
لب پہ نالہ ہے کبھی گاہ بیانِ دہلی

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن اُترتا بہ زبانِ دہلی

چاندنی چوک کا عالم نہ دریبے کا وہ حسن
خاص بازار کی زینت نہ وہ آنِ دہلی

کالے آئے تھے یہ کیا کالی بلا آئی تھی
ہو گئے خاک بسر خورد و کلانِ دہلی

ہائے رے حُبِّ وطن صدمے اُٹھائے کیا کیا
اُس پہ بھی آن بسے لوگ میانِ دہلی

گھر چھٹا شہر چھٹا پر نہ چھٹے حضرتِ عشق
طرفہ معجون ہیں یہ پیر و جوانِ دہلی

شکر صد شکر کہ حکامِ عدالت گستر
باعثِ امن ہوئے آ کے میانِ دہلی

پھر ہو منظور بدل زینت و رونق یہاں کی ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ [1]

شعر جانسوز یہ دو چار تجمل نے کہے ۔۔۔ جی یہ چاہے ہو سنے جاؤں بیانِ دہلی

ایضاً

مل گئے خاک میں سب غنچہ لبانِ دہلی ۔۔۔ آگ لگ جائے تجھے بادِ خزانِ دہلی

چشم نمناک دل افسردہ ہے صد پارہ جگر ۔۔۔ بیٹھے اس طرح سے ہیں غمزدگانِ دہلی

اور مت آگ لگا شمعِ خیالِ جاناں ۔۔۔ خود جلے بیٹھے ہیں دل سوختگانِ دہلی

دربدر خوار پھرے مال لٹا شہر چھٹا ۔۔۔ پیٹیں کس کس کو بھلا ماتمیانِ دہلی

نہ محافل نہ مجالس نہ الگ گوشہ کوئی ۔۔۔ بیٹھ کر روئیں کہاں نوحہ گرانِ دہلی

نہ وہ ناکو نیہ پری چہرہ نہ مہ رو لبِ بام ۔۔۔ نہ وہ بازار نہ وہ سیر کنانِ دہلی

نہ طرحداروں کا بن ٹھن کے نکلنا سرِ شام ۔۔۔ نہ وہ چشمک زنیِ ماہ رخانِ دہلی

نہ وہ عشوہ نہ وہ شوخی نہ وہ غمزہ نہ ادا ۔۔۔ کچھ نئی وضع سے ہیں خوش وضعانِ دہلی

مسجدِ جامع کی رونق نہ وہ گدڑی کی بہار ۔۔۔ نہ وہ زہاد خدارس نہ بتانِ دہلی

سرنگوں ہوتے تھے ہاں دیکھ کے جن کو زاہد ۔۔۔ اب خدا جانے کہاں ہیں وہ بتانِ دہلی

ہائے رے سوزِ محبت کہ پھکا جاتا ہوں ۔۔۔ یاد جب آتے ہیں وہ شعلہ رخانِ دہلی

مال مستی سے جنھیں ہوش نہ تھا دنیا کا ۔۔۔ فاقہ مستی میں وہ ہیں عشرتیانِ دہلی

چوکڑی بھولتے تھے دیکھ غزالانِ ختن ۔۔۔ ایسے انداز کے تھے خوش نگہانِ دہلی

طعنہ زن ہو ویں زلیخا پہ یہاں کے عشاق ۔۔۔ فخر یوسف پہ کریں کج کلہانِ دہلی

مشغلہ اپنا تجمل کرے کیا خاک رقم
ہمنشیں اس کے ہیں کل ماتمیانِ دہلی

[1] ایک مصرعہ کتابت میں رہ گیا یعنی اصل میں نہیں ہے۔

ایضاً

پھر بندھا دل پہ خیالِ دہلی — پھر ہوا رنج و ملالِ دہلی

پھر نئے سر سے طپش ہے دل کو — سر و پچھ پاتا ہوں حالِ دہلی

مٹ گیا عیش و تنعم سب کا — لُٹ گیا مال و منالِ دہلی

ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں ہر جا — کیا ہوئے اہلِ کمالِ دہلی

تھی غضب اس کی ترقی ہے ہے — آفتِ جاں ہے زوالِ دہلی

جان دیتے تھے جہاں کے دلبر — تھا عجب حسن و جمالِ دہلی

حاتم طائی چھپا زیرِ زمیں — دیکھ کر دستِ نوالِ دہلی

جس کو دیکھا اُسے خواہاں اُس کا — سب کے لب پر ہے سوالِ دہلی

خلد اک باغِ خزاں دیدہ ہے — کون کہتا ہے مثالِ دہلی

نہیں بچنے کا پڑے گا بے شک — چرخ کی جاں پہ وبالِ دہلی

کانپا بس خوف سے مریخِ فلک — دیکھ کر جنگ و جدالِ دہلی

ابتدا جیسی ہوئی خوب ہوئی — دیکھیے کیا ہو مآلِ دہلی

بس تجمل کی دعا ہے یہ خدا — اب ترحم ہو بحالِ دہلی

ایضاً

پھرتے چلتے جو میں آنکلا بشہرِ دہلی — وہ مکاں مجھ کو نظر آئے نہ اُس جا وہ مکیں

نہ دُکانوں کی وہ رونق نہ وہ لطفِ بازار — نہ وہ خوبیِ سڑک اور نہ صفائیِ زمیں

نہ کٹوروں کی وہ جھنکار نہ شورِ خلقت — نہ پری زادوں کا وہ خُلق نہ حسنِ نمکیں

نہ وہ کوٹھوں کی سجاوٹ نہ وہ کمروں کی نمود — نہ کوئی ماہ لقا اور نہ کوئی زہرہ جبیں

سب طرف دیکھا نہ پایا کوئی ان کے حسبِ حال
دلِ مضطر نے کسی جائے نہ پائی تسکیں

چرخِ بدکیش کو کیا کوسوں نہ چھوڑے اس نے
وہ نزاکت بھرے انسان وہ اہلِ تمکیں

ایسے ایسے تھے کہ اچھوں کو غش آجاتے تھے
کھول دیتے تھے جدھر اپنی وہ زلفِ مشکیں

خوں رلایا انھیں جلادِ فلک نے کیا کیا
وہم سے کرتے نہ جو ہاتھ حنا سے رنگیں

ملنا دشوار ہے اب ان سے تو ہے یکِ خیال
دلِ بیتاب کو کس طرح سے آجائے یقیں

لگ گئی کس کی نظر کون تھا ایسا کمبخت
کور ہو جائے الٰہی کہیں چشمِ بدبیں

باغ کی سمت جو آیا تو میں کیا دیکھتا ہوں
خاک سی اڑتی ہے گل بوٹے کا واں نام نہیں

جس طرف دیکھا تو اک ڈھیر تھا خار و خس کا
نہ تو نرگس تھی نہ سوسن نہ سمن نے نسریں

سو سوا اٹکھیلی سی چلتی تھی جہاں بادِ نسیم
بادِ صرصر کا بھی دیکھا تو نہ تھا نام کہیں

عندلیبانِ چمن چہچہے کرتے تھے جہاں
ایک چڑیا بھی نہ دیکھی ہاں کرتی چیں چیں

تھی جہاں نغمہ سرائی طیورِ گلشن
مرثیہ خوانوں کی سی آئے ہے آوازِ حزیں

آشیانے ہیں وہاں زاغ و زغن کے صدہا
تھے جہاں سیکڑوں طاؤس ہزاروں شاہیں

چوب پوسیدہ کا انبار پڑا تھا کہ جہاں
سروِ نوخیز کھڑے رہتے بزیب و تزئیں

تودہ تودہ تھا پڑا ہائے وہاں بول و براز
جس جگہ رہتی تھی آراستہ بزمِ رنگیں

چہچہے قہقہے ہیں جن کی گزرتی اوقات
مثلِ ماتم زدہ بیٹھے نظر آئے غمگیں

دیکھ یہ حال بصد حسرت و صد یاس و الم
بس تجمل نے پڑھا مطلعِ ثانی وہیں

ای کہن سال فلک دشمنِ جانِ دہلی
کیا ترے ہاتھ لگا کھو کے نشانِ دہلی

تشنہ ۔ محمد علی مرحوم ۔ دہلوی

خوش فکر مگر آزاد منش اور رند مشرب تھے ۔ پہلے ذوق مرحوم سے اور بعد کو عیش مرحوم سے اصلاح لیتے تھے ۔ ۱۲۸۳ھ میں بمقام ریاست الور انتقال ہوا ۔ (بعض اوقات برہنہ بھی رہتے تھے)

عجیب کوچۂ رشکِ جناں تھا دہلی کا
بہشت کہتے ہیں جس کو مکاں تھا دہلی کا

دماغ بر سرِ ہفت آسماں تھا دہلی کا
خطاب خطۂ ہندوستان تھا دہلی کا

غضب ہے اُس کو کوئی شادماں نہ دیکھ سکا
زمیں نہ دیکھ سکی آسماں نہ دیکھ سکا

ہزاروں زلفِ پریوش کے یاں تھے سودائی
ہزاروں میکش و میخوار مستِ صہبائی

شرابِ عیش پلاتا تھا چرخِ مینائی
قبول کرتے تھے اس در کی سب جبیں سائی

جو آتا تھا سو وہ ہو رہتا تھا اِسی گھر کا
زمیں کی ناف ہے کعبہ ہے بطنِ مادر کا

یہاں کی خاک میں کیفیت ابرِ بہار اِس کی
یہاں کے آب میں تاثیر آبِ حیواں کی

یہاں کی بادِ بہاری ہوا زمستاں کی
یہاں کی آگ میں گرمی تھی شعلہ ویاں کی

ہر ایک شخص کے حق میں یہ شہر اچھا تھا
مریضِ عشق کے بھی واسطے مسیحا تھا

وہ تختِ سلطنت و بارگاہ سلطانی
کہ جس میں بیٹھتے تھے آ کے ظلِ سبحانی

پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی
بجا اس اوج پہ تھا دعویِ سلیمانی

ہر ایک قصر کو دعویٰ تھا طاقِ کسریٰ کا
دماغ عرش پہ تھا قلعۂ معلّٰی کا

کسی زمانہ میں ایسا تھا یاں کا تخت نشیں
خطا و ملکِ ختن سب تھے اُس کے زیرِ نگیں
خراج دیتے تھے سب بادشاہ روئے زمیں
مدام کانپتے تھے اُس سے چین اور ماچین

دیارِ ہند تھا مشہورِ خلق نام اس کا
چراغ روم سے جلتا تھا تا بہ شام اُس کا

زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے ناگاہ
گدا سے ہو گئے بدتر غریب شاہنشاہ
تمام ہو گیا تاراج ملک و مال و رجاہ
رعیت ان کی ہوئی اُن سے بھی زیادہ تباہ

وہ ساہوکار نہ تھا جس کی ساکھ میں بٹا
اب اُس کے نام پہ لگتا ہے لاکھ میں بٹا

یہ لوگ کہنے لگے آگ اس وطن کو لگے
سُنانے اہلِ سخن صاحبِ سخن کو لگے
نظر نہ ایسی الٰہی کسی چمن کو لگے
جو ایک تار بھی باقی ہو تو کفن کو لگے

تمام شہر تلنگوں نے آ کے لوٹ لیا
مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آکے لوٹ لیا

مِلا یہ حکم کہ سب لوگ یاں سے ٹل جائیں
دبے ہیں نقد تو دکھلا کے یہاں نکل جائیں
اسی میں خیر ہے جو شہر سے نکل جائیں
جو کچھ ہو چھوڑ یہاں صاحب بدل جائیں

نہ سر پہ ٹوپی ہے اُن کے نہ پاؤں میں جوتی
بغل میں طوطی کا پنجرا نبی جی بھیجو جی

میانِ راہ کھڑے تھے وہ رہزنِ بے پیر
کہ جن کے ہاتھ میں لاٹھی تھی مثلِ گرزِ نکیر

یہ کہہ رہے تھے کہ آگے بڑھو صغیر و کبیر
کہاں سے کھینچ کے لائی ہمیں کہاں تقدیر

سب اُن کے خوف سے کرتے تھے آہ و نالے لوگ
مثال غول بیاباں تھے گاؤں والے لوگ

گرہ ٹٹولی کسی کی کمر پہ ڈالا ہاتھ
ہر ایک مضطر و خستہ جگر پہ ڈالا ہاتھ
پدر کو چھوڑ دیا تو پسر پہ ڈالا ہاتھ
جو سر برہنہ تھا اُس کے بھی سر پہ ڈالا ہاتھ

الٰہی ہاتھ نہ ٹوٹے ستم شعاروں کے
کہ ہاتھ دھو کے پڑے پیچھے خاکساروں کے

یہاں جو آن کے دیکھی تو دار کی صورت
وہ دار کہیے جسے ذوالفقار کی صورت
مٹا دی چشم زدن میں ہزار کی صورت
نظر پڑی نہ کسی بے قرار کی صورت

برنگِ تیرِ شہاب آگ میں جلے لاکھوں
سپردِ دار و رسن ہو گئے گلے لاکھوں

مکاں کو آ کے جو دیکھا تو لامکاں ہے وہ
جہاں نہ چند بھی بیٹھے اب آشیاں ہے وہ
جو شہر یار کو پوچھا کہو کہاں ہے وہ
تو یہ سُنا کہ کھنڈر دیکھ لو نشاں ہے وہ

نہ اہل شہر رہے اور نہ شہر یار رہا
رہا تو نام ہی خالق کا برقرار رہا

رہی نہ جنس محبت کی اب خریداری
جو یوسف آئیں ہو تو بھی گرم بازاری
اُٹھائے کون حسینوں کی ناز برداری
لگائے دل کو کوئی جان کس کو ہے بھاری

بقول شخص عجب ملک حسن بستی ہے
کہ دل سی چیز یہاں کوڑیوں کو سستی ہے

کسی کا دل نہیں اس دور میں ٹھکانے سے | رہا نہ گانے سے شوق اور نہ بجانے سے
غرض نہ غیر سے مطلب نہ ہے یگانے سے | وفا و مہر تلک اُٹھ گئی زمانے سے

کہاں سے لائیں وہ پہلی سی اب ادا معشوق
اسی سبب سے ہیں مشہور بے وفا معشوق

کوئی کہے کہ تپِ غم کی بس کہ شدت ہے | تو یوں کہیں ہمیں آپ ہی حرارت ہے
چڑھا ہوا ہے بخار آج کل یہ نوبت ہے | تم اپنا کام کرو۔ جاؤ تم کو صحت ہے

مریض جا کے کرے کیا کہ طعن کرتے ہیں
طبیب اپنا مرض خود بیان کرتے ہیں

جو شعر کہتے ہیں اور لوگوں کو سناتے ہیں | وہ بیٹھے رہتے ہیں آپ ہی اور رنجاتے ہیں
جو قدردان نہیں اپنا کسی کو پاتے ہیں | تو دل ہی دل میں وہ خون جگر کو کھاتے ہیں

غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے
مذاق شعر و سخن اُٹھ گیا زمانے سے

ثاقب۔ نواب شہاب الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

خلف اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں والی لوہارو۔ و رئیس اعظم دہلی شاگرد مرزا غالب ۲ محرم الحرام ۱۲۸۶ھ مطابق ۹ اپریل ۱۸۶۹ء بعمر ۲۹ سال انتقال ہوا۔

ہے کہن سال فلک دشمنِ جانِ دہلی | کیا ترے ہاتھ لگا کھو کے نشانِ دہلی
حیف صد حیف کہ دی شاہجہانی تعمیر | وائے صد وائے مٹی شوکت و شانِ دہلی
واں قلعہ ہے نہ دریبہ نہ سڑک پھر کیونکر | دِلی والوں کو ہو جنت پہ گمانِ دہلی
اس کی ویرانی سے آباد ہوئے اور بلاد | ہے بہارِ چمنِ دہر خزانِ دہلی
اہلِ دہلی نہ کریں بخت کا شکوہ کیونکر | بخت خاں ہی ہوئے جب باج ستانِ دہلی

سحر آہنگ مغنّی تھے ہزاروں لاراب — کچھ جو باقی ہیں سو ہیں مرثیہ خوانِ دہلی
حاکمِ عادل و دانا کو خدا نے بھیجا — تب یہ آباد ہوئے چند مکانِ دہلی
کون وہ داورِ جم مرتبہ کو ہر صاحب — کہ جسے خلق کہے شاہجہانِ دہلی
شہر والوں کو بھی وردِ زباں ہے شب و روز — کہ سلامت رہے یہ فیض رسانِ دہلی
پھر وہی مسجدِ جامع کے ہی بازار کی دھوم — پھر ہی آراستہ ہر ایک مکانِ دہلی
پاس مسجد کے شفاخانہ ہے ایسا کہ جسے — ہے بجا کہیے اگر روحِ روانِ دہلی
قلعہ میں ہے وہ پریزاد عجائب خانہ — کہ صنم خانۂ چیں ہے نگرانِ دہلی
چاندنی چوک بگڑ کر وہ بنا از سرِ نو — کہ کہیں گے ہم اسے بختِ جوانِ دہلی
چوک کے باغ میں وہ رنگ ہے آرائش کا — کہ قسم کھائیے ہے فردوس بجانِ دہلی

اہلِ ایراں یہ غزل سن کے کہیں گے بیتاب — بود ثاقبؔ مگر از اہلِ زبانِ دہلی

حسامی۔ مرزا حسام الدین حیدر مرحوم۔ دہلوی

ان کے والد کا نام مرزا خانی تھا۔ فکرِ معاش سے تعلیم کی مہلت نہ ملی۔ موزونیٔ طبع سے شعر کہہ لیتے تھے۔ موسیقی میں بھی دخل تھا اور اپنا کلام خود گاتے تھے۔ داستان گوئی اور جلا کاری ذریعہ معاش تھا۔ سنہ ۱۸۸۲ء مطابق سنہ ۱۳۰۰ھ میں زندہ تھے۔

کئی باپ بیٹ جو ہوا ہلٹ نہیں دل کو جیسے قرار ہے — کروں غم ستم کا بیان کیا مرا غم سے سینہ فگار ہے
ولے شہر دہلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن — وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہ عیاں ہے ہند تباہ ہوئی کہو کیا کیا ان پہ جفا ہوئی — جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تُلیں نہ کبھی خانم سے وہ چپ گھلیں
ملے طوق قید میں جب اُنھیں کہا ڈالے گل کے یہ ہار ہے

جو سلوک کرتے تھے اور سے اب ہیں وہ لکھوں کس طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے ہاتھ پاؤں سے نہ تار ہے

یہ جو بوئے تھے پیڑ ببول کے ہیں انھیں میں آج پھل لگے
جیسے جیسے ہم نے گناہ کیے یہ انھیں گناہوں کا بار ہے

پڑی آکے جانوں پہ ایسی بن کہ بنے ہوئے سبھی ہرن
جسے دیکھتا ہوں پڑا ہوا ہے گلے میں ناکوں کا ہار ہے

یہ بال تن پہ ہی سر مرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
بچے غم سے نکلے جو دم مرا مجھے اب زندگی بار ہے

یہاں حال یہ کہ جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
یاں بہار ہیں تو خزاں پڑی وہاں اُن کی کھفوں کی بہار ہے

یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بے گنہ
وہی کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی اُن کے دل میں غبار ہے

نہ تو دشمنائی ہے غیر میں نہ ہے اپنا یاں کوئی ہمسب
چلا تیر اجل کا بھی شہر میں کیا لاکھوں کلیجے شکار ہے

دیا جس نے غم ہے یہ برملا تو خوشی بھی دیگا وہی خدا
بھلا کون یہ نہیں جانتا کہ خزاں کے پیچھے بہار ہے

یہ زمانہ وہ ہے برا فلک چلو بیچ کے سب سے الگ الگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یاں نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

کیا حامی ڈر تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا کہ وہ تیرا حامیِ کار ہے

حالی۔ مولنا الطاف حسین مرحوم پانی پتی

والد کا نام خواجہ ایزد بخش انصاری تھا ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے شیفتہ مرحوم کے اور بعد کو مرزا غالب مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ ۴۰-۴۵ سال کی مشق سخن کے بعد شاعری کی روش بدل کر "مدو جزر اسلام" مشہور اور مقبول مسدس لکھا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۴ء م ۱۳۳۳ھ انتقال کیا۔ یہ غزل شرکت مشاعرہ کی آخری یادگار ہے۔ اس کے بعد مشاعرے میں غزل نہیں پڑھی یہ غزل ان کی بیماری کا [illegible]

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہی نظربازوں کی — دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی — زد میں تیر صف مژگاں کی نہ جانا ہرگز
چاہت اک طلعت مکروہ ہی برقع میں نہاں — کسی ولالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے — تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز
جتنے رمنے تھے تمہے ہو گئے ویراں ای عشق — آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے تمہے قدر شناس — قدر رہیا ہی رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
تذکرہ دلی مرحوم کا ای دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا ای بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہی دل شوریدہ بہانے مطرب — دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا ای چشم — دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت ای سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — ای فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے — ایسا بدلا ہی نہ بدلے گا زمانا ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں — نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا ای چرخ — ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہی — ان کی ہنسی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہی ساقی — بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یہاں سے رخصت ہو سدھیے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یہاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

داغ۔ نواب مرزا خاں مرحوم۔ دہلوی

سلطان الشعرا۔ بلبل ہندوستان۔ جہاں استاد۔ ناظم یار جنگ۔ دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء دہلی محلہ بلی ماراں میں پیدا ہوئے ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں سب سے پہلی غزل نواب شیفتہ مرحوم کے مشاعرے میں پڑھی۔ قلعہ چھوڑنے کے بعد ۲۴ سال ریاست رامپور میں رہے اور نواب رامپور کے ساتھ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد پہنچے ۲ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ م ۱۸۹۴ء سے بحیثیت استاد نظام ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اور دوران امیدواری کی تنخواہ بھی اسی حساب سے ملی۔ ۱۸ سال تک حیدرآباد رہ کر ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ م ۱۹۰۴ء

مطابق ۱۱ر فروری سنہ ۱۹ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ وہیں یوسف شریف صاحب کی درگاہ میں دفن کیے گئے۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی — بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دلی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دلی — مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

رہی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانندِ صبح نورانی — یہاں کے ذرہ میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعلِ رمانی — یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی

یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغِ رشکِ تجلیِ طور تھا اس کا

فلک تھا خوبیِ حسن و جمال کا دشمن — صباحِ عشرت و شامِ وصال کا دشمن
عدوئے اہلِ کمال اور کمال کا دشمن — غرضکہ اب تو ہوا جان و مال کا دشمن

یہ مفت پر جو تلاشی ہیں نقدِ جاں کے لیے
خضر بھی روئیں گے اب عمرِ جاوداں کے لیے

خدا پرستی کے بدلے جفا پرستی ہے — جو مال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے

بجائے ابرِ کرم مفلسی برستی ہے　　بتنگ جینے سے ہیں ایسی تنگدستی ہے

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا
یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعین　　جو مانا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دین
یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دینِ متین　　کیئے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسین

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا کام ہی تمام کیا

فلک نے قہر و غضبناک تاک کر ڈالا　　تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا　　غرضکہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھچیں ہیں کانوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

عجیب شکل گل و گلستاں نظر آئی　　پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے نامژۂ خونچکاں نظر آئی　　تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

کھلایا زہر ستمگر نے پان کے بدلے　　پلایا خونِ جگر پیچوان کے بدلے
نصیب دار ہوئی ہے نشان کے بدلے　　ملا نہ گور گڑھا بھی مکان کے بدلے

عداوتِ فلکِ کینہ ساز تو دیکھو
اور اس پہ اس ستم آرا کے ناز تو دیکھو

لہو کے چشمے ہیں چشمِ پُر آب کی صورت
لٹے ہیں گھر دلِ خانہ خراب کی صورت
شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
کہاں یہ حشر ہیں تو یہ عذاب کی صورت
زبانِ تیغ سے پرسش ہے دادخواہوں کی
رسن ہے طوق ہے گردن ہے بے گناہوں کی

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے
نہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے
ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے
غرض یہاں کے لیے ایک جہان روتا ہے
جو کہیے جوشش طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگ بوئے گل اہلِ چمن چمن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
غریب چھوٹ کے اپنا وطن وطن سے چلے
قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

یہ خاصیت تو نہ رکھتی تھی زہر کی گرمی
نہ دیکھیں جو نگہ خشم و قہر کی گرمی
یہاں تھی شعلہ عذارانِ شہر کی گرمی
اُٹھائیں ہائے وہ جلتی دوپہر کی گرمی
تپش سے ایک بیابان آفتاب ہوئی
زمین مگر کرۂ نار کا جواب ہوئی

جگہ جگہ سے تھے زمیندار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر ایک گنوار کی صورت
چڑھے ہی آتے تھے سر پر بخار کی صورت
چھپی نہ اُن سے ہر اہلِ دیار کی صورت
کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا

تو اہلِ قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا

زبان بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی — ملیں جو خاک بھی منہ پر تو مل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی — پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی

جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پہ سر کٹتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھٹکتے ہیں

بنا ہے خالِ سیہ رنگ مہ جمالوں کا — دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا — عجیب حال دگرگوں ہے دلّی والوں کا

کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پیادہ پا ہوئے واں شہسوار صد افسوس — لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوئے اہلِ وقار صد افسوس — ہزار حیف دلِ بے قرار صد افسوس

جھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے سینے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی — تلاش بہرِ سیاست ہے خوش بیانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی — کہ حکمِ عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی

یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جبکہ حالِ تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ

غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں — کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں — جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں

پئیں جو آبِ بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمتِ باری تو قہر ہو جائے

جہاز ایسا تباہی میں آ گیا اپنا — ملا نہ تختہ تیرا تک کہیں پتا اپنا
رہا نہ آہ زمانے میں آشنا اپنا — بجز خدا کے نہیں کوئی ناخدا اپنا

کسی سے ڈوبے ہوئے ایسے کب نکلتے ہیں
یہاں سے حضرتِ الیاس بچکے چلتے ہیں

یہ وہ جگہ ہے کہ عبرت پہ عبرت آتی ہے — یہ وہ جگہ ہے کہ شامت پہ شامت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ آفت پہ آفت آتی ہے — یہ وہ جگہ ہے کہ حسرت پہ حسرت آتی ہے

یہ وہ جگہ ہے جہاں بیکسی بھی ڈر کے چلے
یہ وہ جگہ ہے اجل خوف کھا کے مر جائے

کہاں تک آہ لکھوں اس کا حال بربادی — لکھوں کہاں تک اس آسماں کی جلادی
کسی کو قیدِ محن سے نہیں ہے آزادی — کہ داغ داغ ہے ہر دل ہر ایک فریادی

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دکھلا دے
الٰہی پھر اسے حسبِ مراد دکھلا دے

ایضاً

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی — تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی
لے گئے لوٹ کے اب شوکت و شانِ دہلی — پوربیے پہلے اڑاتے تھے زبانِ دہلی
دلی والوں کے لئے تازہ بنے گی جنت — لے گئے سر پہ ملک تختہ مکانِ دہلی

گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب — گل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی

رشکِ شمشاد تھا ہر خوش قد و ہر خوش رفتار — سروِ آزاد تھا ایک ایک جوانِ دہلی

عارضِ صاف تھا ایک ایک مصفا بازار — چشمِ پر جلوہ تھی ایک ایک دکانِ دہلی

اس سے بڑھ کر کوئی محشر نہیں طولِ حساب — بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیانِ دہلی

دیدیا فوج کو حکام نے انعام میں سب — گنجِ قاروں سے فزوں گنجِ نہانِ دہلی

قلعہ کی بیچ کا میدان پھر اس میں دھڑک — کہ بدل کہیے جسے ہر دل و جانِ دہلی

گر یہ میدان نہ ہوتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا — تنگ ہی رہتی سدا روحِ روانِ دہلی

روکشِ سدِّ سکندر اسے کہیے تو بجا — فتح گڈھ ہی جو پہاڑی پہ قرانِ دہلی

یا خدا مسجدِ جامع کا رہے نام بلند — کعبہ والے کہیں وہ آئی اذانِ دہلی

میرؔ و غالبؔ و آزردہ سے پھر لوگ کہاں — داغؔ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

راقمؔ۔ مرزا حسین علی خاں مرحوم۔ دھلوی

عارفؔ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ شدتِ رنج یا کثرتِ غم سے ایک ہی مطلع کہا مگر بہت ہی جل کر کہا۔ ۱۸۵۸ء میں جب یہ مطلع لکھا زندہ تھے۔

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی — کس کی یا پوتیں بنے مرثیہ خوانِ دہلی

رضوانؔ شمشاد علی بیگ خاں مرحوم دہلوی

سالکؔ دہلوی کے بڑے بھائی اور مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے بلند پرواز شاعر تھے۔

۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں بعمر ۴۰ سال انتقال کیا۔

تیری فریاد سے ظاہر ہے بیانِ دہلی — دلِ خوں گشتہ ہے داغِ زبانِ دہلی

ہم کو معلوم تصور سے ہوا ہے اتنا — عرش سے بڑھ کے ہے کچھ رفعتِ شانِ دہلی

کحل مازاغ لگاؤ تو کھلے راز کہ ہے — چشمِ عالم اور روحِ جہانِ دہلی

شہرِ دہلی کو اگر ہند کا دل کہیے فرض — حضرتِ قلعہ کو ٹھہرائیے جانِ دہلی

ہم نے پائے نہ ہنرمند کہیں دلّی سے — ہم نے دیکھا نہ کوئی شہر بسانِ دہلی

چھوڑ دے زہد کو زُنّار پہن لے زاہد — ایک نظر دیکھے جو اندازِ بتانِ دہلی

حسنِ یوسف جو نہ دیکھا ہو کسی نے دیکھے — ہر دکاں دار کے ہے پاس میانِ دہلی

ہم کو رونا تو یہی ہے کہ مٹے ہم برباد — اور اغیار ہوئے عشرتیانِ دہلی

گر نہ ہوں ہم تو ہو بازار میں گرمی کیونکر — ہم ہی تھے جنسِ گراں بارِ دکانِ دہلی

دستِ یغمائے فلک سے نہ رہا کچھ باقی — ہاں مگر واسطے نالے کے زبانِ دہلی

ہے عدم کی تجھے منظور خدایا رونق — کہ اٹھایا انھیں جو لوگ تھے جانِ دہلی

کیا ہیں درکار مکانات ارم میں یارب — کہ اُٹھے جاتے ہیں دلّی سے مکانِ دہلی

انتہا گم شدگی کی ہے عدم ہو جانا — ہم نے پایا نہ عدم میں بھی نشانِ دہلی

کیا بتاؤں کہ ہوں کس صدمے سے رضواں خاموش
دلِ خوں گشتہ ہے داغِ زبانِ دہلی

سالک۔ مرزا قربان علی بیگ خاں مرحوم دہلوی

حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تربیت پائی۔ ابتدا میں مومن کے اور بعد کو غالب کے شاگرد ہوئے۔ آخر میں بزمانۂ قیام حیدرآباد ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں وہیں انتقال ہوا۔

جہاں میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد ۔۔۔ بس اُن بلاد میں تھا منتخب جہاں آباد
اُجڑ کے یاں سے نہ پوچھو ہوا کہاں آباد ۔۔۔ گیا عدم کو دوبارہ ہوا وہاں آباد
فلک نے کس سے کہوں کیوں اُٹھا لیا اُس کو
ارم کا قصر سمجھ کر اُٹھا لیا اُس کو

زبسکہ رکھتے ہیں دل سے عزیز سب اُس کو ۔۔۔ زمیں پہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں [illegible] اُس کو
سنا ہے بستے ہوئے آسماں پہ جب اُس کو ۔۔۔ بلند شہر کہیں کیوں نہ لوگ اب اُس کو
یہ اُٹھ گیا ہے اور اُٹھا نشانِ رفعت ہے
بلند شہر کو کیا ورنہ اس سے نسبت ہے

زمین پست یہاں کی تھی آسماں منظر ۔۔۔ ہر ایک ذرّہ یہاں کا تھا مہر کا ہمسر
یہاں کی خاک تھی اکسیر سے بھی کچھ بہتر ۔۔۔ یہاں کی آب میں آبِ حیات کا تھا اثر
نسیم خلد سے بہتر سموم تھی یاں کی
یہ وہ چمن ہے کہ دُنیا میں دھوم تھی یاں کی

ہر اک مکان یہاں کا تھا ایک مکانِ سرور ۔۔۔ ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک جہانِ سرور
ہر اک دُکان یہاں کی تھی اک کانِ سرور ۔۔۔ غرضکہ شہر تھا تھا یہ ایک کانِ سرور
جدھر کو دیکھئے آواز بربط و نَے ہے
نجانتا تھا کوئی رنج و غم کو کیا شے ہے

یہ شہر کس لیئے برباد ہو گیا یارب ۔۔۔ لگی کسی کی یہ کیا ایسی بددعا یارب
یہاں کے لوگوں سے کیا ہو گئی خطا یارب ۔۔۔ ہوئے ہیں کس لیئے یہ مورِ جفا یارب
غرض تھی غدر سے ہو ویں گناہگار تلفات

وگرنہ ہوتے نہ ہرگز سزائے دار ثقات

چلی تھی دہر میں گویا ہوا یہ چوپائی
کہ فوج باغیہ چاروں طرف سے یاں آئی
تمام شہر کی خوب آکے خاک اڑوائی
یہ بادِ تند تھی خاشاک کی تمنائی
رہی نہ خاک بھی امن و امان کی صورت
کچھ اور ہو گئی سارے جہان کی صورت

یہ انقلاب ہے یا ہے قیامتِ صغرا
کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی ہے آدمی کی شکل شہر میں عنقا
بنا ہے ہو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچہ
ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد
ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہاں آباد

کسی کے لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر
کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پر کوئی ہے تھامے جگر
غرضکہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر
بجائے زمزمہ ہر جائے شیونِ غم ہے
محلّ عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے

مکاں شکستہ ہیں مانند خاطرِ مایوس
اُجاڑ کوچے بسانِ دلِ الم مانوس
وہ شکل ہی نہ رہی شہر ہو گیا معکوس
ستم کیا فلکِ بد شعار نے افسوس
یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنے کو خلقت آئے
اور اب جو دور سے دیکھے کوئی تو عبرت آئے

سمجھ کے اپنا ٹھکانا سے لگے جہاں ہم لوگ
ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ
پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ

زمین ہو گئی دشمن نہ پائی جائے ثبات
ٹھہر سکا نہ کسی جا پہ اپنا پائے ثبات

وہ لوگ کھاتے تھے جن کے نشاط کی قسمیں ہوئے ہیں طالعِ ناسازگار کے بس میں
محل میں رہتے تھے یا اب ہوئے ہیں محبس میں نہ تاب دل میں ہے طاقت نہ جانِ بیکس میں

جو تشنہ لب ہوں تو آبِ دمِ سناں موجود
جو گرسنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود

ہوئے ہیں قتل جو بے جرم لوگ دلی کے بہشت چاہیے پہلے انھیں قیامت سے
کیا جنابِ الٰہی میں عرض رضواں نے کہ آج کل درِ فردوس کس طرح سے کھلے

ملا جواب کہ دلی کو لاؤ اٹھوا کر
اور اس گروہ کو اس میں بساؤ لے جا کر

وہ جن کی طبع کہ آسودگی پہ مائل ہے پیادہ کیونکہ چلیں ناقہ ہے نہ محمل ہے
اٹھائیں ایک قدم بھی اگر تو مشکل ہے قدم کہے کہ ٹھہر جاؤ یہ ہی منزل ہے

سروں پہ بوجھ ہے گٹھری کا لڑکھڑاتے ہیں
بس اپنے جی کی طرح بیٹھ بیٹھ جاتے ہیں

لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا یہ ہے بیان مجھ سے ہو کیونکر یہ ماجرا ہی ہے
نہ آئی جن کی کبھی در تلک صدا ہی ہے نکل کے گھر سے چلیں وہ پیادہ پا ہی ہے

کبھی نہ غصہ میں بھی جا سکے جو باہر ہوں
غضب ہے یہ کہ وہ بے پردہ اور چادر ہوں

ہجومِ مسجدِ جامع کا کیا کروں اظہار صفِ ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار

ہر ایک صف میں نہ رہنا مصلّیوں کا شمار
اب اس کو دور سے بھی دیکھنا ہوا دشوار
نماز ہے نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اُس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہے

وہ اُس کے گرد کے بازار اور وہ زینت
کہ جس کے دیکھنے سے طبع کو ہو اک فرحت
ہجوم خلق سے ہر روز ایک نئی صورت
یہاں سے جائیے کبھی میلہ میں تو ہو نفرت
الٰہی کیا ہوئے اجناسِ رنگا رنگ کے ڈھیر
پڑے ہوئے ہیں گل و خشت و چوب و سنگ کے ڈھیر

درازدستیٔ دیہاتیانِ بدانجام
کسی طرح سے سمجھ میں نہ آئے جن کا کلام
خدا دکھائے نہ صورت کبھی سنائے نہ نام
گریز پا جو نکل کر گئے لٹے وہ تمام
لٹا لباس تلک آبرو بھی ہاں کھوئی
گرہ میں کچھ بھی نہ نکلا تو نقدِ جاں کھوئی

بچاؤ جان کے اس جان کی محبت میں
تو گیر و دار سے آیا وہاں بھی آفت میں
گیا جو مضطربانہ کسی ریاست میں
یہاں سے اور زیادہ پھنسا مصیبت میں
جو نقد کچھ ہے تو مخبر کا قرضدار بنا
وگرنہ بے گنہی میں گناہگار بنا

بیان سن کے یہ سالک اُڑے جو میرے ہوش
ہجومِ فکر سے خون دل میں مارتا تھا جوش
بسانِ صورتِ دیوار رہ گیا خاموش
کہ ناگہاں تنِ غیب سے یہ بانگِ سروش
رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

روئے جنت میں بھی ہم کرکے بیانِ دہلی — اس سے ظاہر ہی نہیں خلد بسانِ دہلی
اس کے مٹنے سے ہوئی عالمِ بالا کی نمود — ورنہ تھی رشکِ فلک شوکت و شانِ دہلی
کس کا پتھر کا ہی دل کس سے سنا جاتا ہی — کون ایسا ہی کہ ہو جس سے بیانِ دہلی
محشرِ غدر سے بھی مٹ نہ سکا اس کا وجود — ہی الگ عالمِ فانی سے جہانِ دہلی
ہنستے ہیں بختِ زلیخا پہ تو یوسف پہ طعن — دیکھ کس تبہ کے ہیں پیر و جوانِ دہلی
ہی خط و خال کا عالم وہی اب تک گویا — ہی اسی وقت کی نکلی ہوئی جانِ دہلی
حسرتوں کا ہی مکینوں کی عجب ہنگامہ — رہے آباد اُجڑ کر بھی مکانِ دہلی
مٹ گئے پر بھی تو ملتا نہیں دلی کا جواب — کوئی ڈھونڈے تو اسی پر ہو گمانِ دہلی
من و سلوی کے مزے سے ہو وہ کیونکر آگاہ — جس نے کھایا ہی نہ ہو زلہ خوانِ دہلی
ہوتے ہیں دور کے بس ڈھول سہانے واعظ — خلد میں کیا ہی نہیں ہی جو میانِ دہلی
میں نے دیکھا ہی ملائک کو خریدار اس کا — میں نے چلتی ہوئی دیکھی ہی دکانِ دہلی
اس قدر خلخ و نوشاد کی تعریف نہ کر — ہمنشیں آ تجھے دکھلاؤں بتانِ دہلی
غالب و نیر و ثاقب سے بنا ہی گویا — بلی ماروں کا محلہ صفہانِ دہلی

سن کے ہر شعر پہ کیونکر نہ ہوں آنکھیں نمناک
سالک غمزدہ ہی مرثیہ خوانِ دہلی

ایضاً

شہرِ دہلی ہوا ہی کیوں خالی — کیوں مٹی یاں سے صورتِ آدم
زورِ بازارِ موت دیکھ کہ چین — ملک الموت کو نہیں ایک دم

ڈھیر کس جا نہیں ہے مُردوں کا
کس زباں پر نہیں فغاں پیہم

نہیں تل دھرنے کی زمیں میں جگہ
مُردے کا دفن ہو بلا سے اہم

خاکِ آسودگانِ پیشیں پر
یہ نئے طور کا ہوا ہے ستم

ایک کی قبر میں گئے تنہا اور
تنگیِ جا سے لڑتے ہیں باہم

قافلہ قافلہ گئے کیوں لوگ
کب ہے اتنا وسیع ملکِ عدم

نہیں جاتے مگر عدم کو یہ لوگ
اور ہی نکتہ اس میں ہے مبہم

کرۂ خاک و باد و آتش و آب
فرطِ خلقت سے ہو گئے تھے کم

روئے اپنی کمی پہ یہ چاروں
ہو گیا رحم خالقِ عالم

دے دیے اُن کو لیکے خلقت سے
کچھ عناصر جو مل رہے تھے بہم

سپہرؔ منشی شہاب الدین خاں مرحوم دہلوی

مرزا صابر دہلوی کے شاگرد تھے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

مٹ گیا صفحۂ عالم سے نشانِ دہلی
مثلِ عنقا ہے زبانوں پہ بیانِ دہلی

نظر آتا ہے ہر اک جا پہ نگاہوں کا ہجوم
کیوں نہ ہو گرمیِ بازارِ دُکانِ دہلی

ان سے بیجا ہے ہمیں کم سخنی کا شکوہ
کہ ہیں خاموش مصیبت زدگانِ دہلی

روز رہتے ہیں تزلزل میں یہاں کے ساکن
آفتِ جاں ہیں مگر مدعیانِ دہلی

خوب برباد کیا رشک سے گردوں نے اسے
ہے جو مشہورِ جہاں عظمت و شانِ دہلی

جی بہلتا ہے اسے سُن کے مسلمانوں کا
گویا افسانۂ جنت ہے بیانِ دہلی

اس کے بچنے کی نہیں ہے کوئی اُمید اب تک
ملک الموت کے قبضہ میں ہے جانِ دہلی

جو بلا آئی گئی پھر نہ یہاں سے پھر کر
کیا ہی دلچسپ ہے ہر ایک مکانِ دہلی

اس کے طبقے کو جو اُلٹا ہے فلک سچ بتلا
کوئی یونان کا طبقہ تھا بسانِ دہلی

ہو اس کا جو فصیحان جہاں سے نہ جواب
گویا قرآں کی زباں ہے یہ زبانِ دہلی

آسماں کیا کہ زمیں بھی نہیں تھمنے دیتی
چرخ ساں پھرتے ہیں آفت زدگانِ دہلی

اس زمیں پر نہیں بسنے کی ہے اُمید سپہر
آس بھی ٹوٹ گئی مثلِ مکانِ دہلی

سوزاں حکیم محمد تقی خاں مرحوم دہلوی

طبیب حاذق تھے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اس مسدس کے سوا اور کلام یا دیگر حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔

ہر ایک شہر میں، شور و بکا ہے دہلی کا
فغاں کہ نام و نشاں کیا مٹا ہے دہلی کا

عجیب حال یہ جس نے سُنا ہے دہلی کا
دلِ دو نیم ہے وہ اجڑا ہے دہلی کا

خطا نہ کرو وہ جو پامال ایک جہاں ہوئے
ہماری آنکھوں سے کیونکر نہ خوں رواں ہوئے

خدا نے عرش سے تا فرش جب کیا پیدا
زمیں پہ رہنے کا انساں کو جب یہ حکم ملا

جو انتخاب جہاں تھے سو ہند میں رکھا
رہے تھے مل کے وہیں دیکھو آدم و حوّا

کسی کا نام رکھا روم اور کسی کا شام
ہے اس مقام کا ہندوستان جنت نام

جہان آباد کے ذرہ میں تھی زر افشانی
کلاہِ زر تھی گدائی پہ زر کی ارزانی

جو آتا تیرہ دروں سنگ یہاں بدخشانی	جلا وہ پاتا یہیں ہوتا لعل رمّانی

ہر ایک خوبی و حسن و جمال اس میں تھا
کمالِ اہلِ کمال اور کمال اس میں تھا

بجائے زر یہاں جوہر کی تھی فراوانی	نصب تھے لعل و گہر تھا جو تختِ مرجانی
یہیں برستے تھے گوہر زابرِ نیسانی	زمیں پہ ٹھوکریں کھاتے تھے درِّ غلطانی

یہ بدرِ نور یہ ضیا رشکِ مہرِ خاور تھا
یہ بحرِ جود و سخا کانِ سیم و گوہر تھا

یہ شہر وہ تھا کہ سب جامِ جم اسے کہتے	سمجھ تھی جن کو وہ رشکِ ارم اسے کہتے
یہ شہر وہ تھا کہ بحرِ کرم اسے کہتے	بجا تھا چشمۂ فردوس ہم اسے کہتے

اسی کے پینے کا شایق ہر ایک سرور تھا
یہ شہر وہ تھا کہ سرتاجِ ہفت کشور تھا

وفورِ حسن و لطافت میں اس کا تھا شہرا	یہ کانِ علم و ہنر میں تھا ایسا ہی یکتا
کسوٹی کہتے ہیں جس کو وہ شہرِ دہلی تھا	یہاں کے سنگ میں پارس کا تھا اثر پیدا

وطن کو چھوڑ ہر ایک سمت سے جو آتے تھے
اسی شہر سے سب انسان بن کے جاتے تھے

غریب پرور و کانِ کمال تھا یہ مقام	عدیل اس کا نہ تھا جانتے ہیں خاص و عام
بر آتی آرزو اُن کی جو آتے یاں ناکام	یہاں سے نام وہ پاتے جو ہوتے تھے گمنام

سندِ جہاں کو بھی عالی مقام سے اس کے
یہ اعتبار تھا عالم کو نام سے اس کے

جگر ہو ٹکڑے فسانہ ہے وہ بلا اس کا　　ہر ایک مکان و مکیں خاک میں ملا اس کا
وقار جتنا بڑھا تھا گھٹا سوا اس کا　　ہزار حیف کہ اب نام بھی مٹا اس کا

دعائے بد کسی ایسے ہی پُر جفا کی لگی
یقین جان کہ اس کو نظر بلا کی لگی

نہ پوچھو کجروی چرخِ پُر بلا ہم سے　　یہ سب کا دُشمن جاں ہے مگر سوا ہم سے
چھٹایا اس نے وطن اور دلربا ہم سے　　سزا اسے بھی ملے پوچھ کر خدا ہم سے

اس آسمان پہ ہو عرش سے بلا نازل
جلا کے اس نے کیا خاک ہے ہمارا دل

ہمارے ساتھ کہاں کی اسے عداوت ہے　　جہان ہے تہ و بالا یہ کیسی آفت ہے
ہوا جو حشر ہے برپا یہی قیامت ہے　　یہ خوش نہ ہووے کہ اس کی بھی آئی شامت ہے

ہمارے نالۂ سوزاں اسے جلا دیں گے
فلک کو دیکھنا ہم خاک میں ملا دیں گے

جہان آباد کو برباد کر دیا اس نے　　جو شاد رہتے تھے ناشاد کر دیا اس نے
غم و الم کو بس آباد کر دیا اس نے　　خوشی کے نام کو آزاد کر دیا اس نے

یہ ہے ہمیشہ سے دنیا میں دُشمنِ خونخوار
اسے بھی کاش ملے سامنے ہمارے دار

سمجھ میں آتا نہیں کیسی یہ بلا آئی　　عدو ل حکمی کی دلبر جو فوج یہ چھائی
کہیں یہ کس سے کہو کس کی تھی یہ گمراہی　　ہوا ہی زشتیِ اعمال کی یہ رُسوائی

بلا یہ پوربیے میرٹھ کے جو یہاں لائے

عمل ہمارے مجسّم یہ سامنے آئے

اُنھوں کے آتے ہی دہلی میں قتلِ عام ہوا　　جو سروران حکومت تھے ڈھونڈ کر مارا
وہ بچّے پھول کی پتّی سے جن کو ذبح کیا　　گیا زمیں سے فلک تک یہ شور واویلا

خدا کا خوف نہ آیا وفا کو چھوڑ دیا
ستم یہ دیکھ جفا نے جفا کو چھوڑ دیا

جو ظلم آنکھوں سے دیکھا کہا نہیں جاتا　　سنا جو کانوں سے اُس کو لکھا نہیں جاتا
نشانِ نقشِ ازل تو مٹا نہیں جاتا　　کرے بیان جو اُس کا سنا نہیں جاتا

ہوا نہ جاتی تھی بے اذن جن کے گلشن میں
وہ خاک چھانتے پھرتے ہیں جنگل و بن میں

یہ سرکشی ہوئی میرٹھ کی فوج سے جس دم　　نہ کارتوس کو کاٹا ہوئی تھی جو برہم
یہاں وہ آئی تو آیا تھا سب کا ناک میں دم　　جو افسر اُن کے تھے پہلے کیا سر اُن کا قلم

ہوئے جو قتل وہ دیوانِ عام کے آگے
فرشتے چھوڑ زمیں آسمان کو بھاگے

یہاں کے جتنے تھے اوباش مل کے اُن کے ساتھ　　کہا بتائیں تمھیں زر کے ہاتھ آنے کی گھات
مگر یہ شرط ہی گر آئے کچھ ہمارے ہات　　برائے نام نکالی یہ لوٹنے کی بات

جو اونچا گھر کوئی تکتے تو اُس پہ چڑھ جاتے
فرنگی اس میں ہیں یہ کہہ کے گھر وہ لٹواتے

وہ بے نیازی دیکھی جو اُن کی کجرائی　　جفا و جور و ستم کی نہ واں ادا بھائی
عذاب جب ہوا نازل زمین تھرّائی　　پھر اُن کے ساتھ ہی دلی پہ اک بلا آئی

عتاب آوے تو اس پر وہاں جو ارا نہیں
گناہ کردہ و ناکردہ کا شمار نہیں

ہوئی جو عرش سے نازل بلا تو کس سے رکے
جو کام تھا وہ یہ اول تمام کر ہی چکے
کچھ اس کی وہاں نہیں پروا جو لاکھ ہوں سجدے
نزول سے پہلے جھکے سر سے اب جھکے تو جھکے

وہاں ہے کس کو مجالِ کلام و تابِ سخن
ولی ہیں خوف سے بیٹھے لگائے مہر دہن

یہ جوق جوق جو دہلی میں جمع تھے ظالم
کٹے ہزاروں نہ باقی رہا کوئی سالم
لڑے پھر اُن سے ہمیشہ جو ان کے تھے حاکم
جو اس میں بھید تھا اُس کا خدا ہی ہے عالم

پڑے جو گولے توپ دین بھاگے اور ترسا
جب آسمان سے مینہ اُن پہ آگ کا برسا

اکڑ کے پنجوں کے بل جو زمین پہ چلتے
تفنگ و تیغ کو چمکاتے ہر گھڑی ملتے
جو سیدھی بات کرے اُن سے اُس کو وہ دلتے
نشہ میں لاف وہ کرتے تو سُن کے سب جلتے

ہوئے تھے جو کہ مقابل ہے بے سنان و سیف
دماغ جھڑ گیا اُن کا رہا نہ باقی کیف

رعایا کو ہوا دشوار شہر کا رہنا
نہ جانتے تھے کہ ہوتا ہے کیا ستم سہنا
ہوئے خراب جنہوں نے نہ مانا تھا کہنا
بجائے اشک ہوا خون چشم سے بہنا

نہ تھی وہ قابلِ رحمت پڑے نہ اب پالا
جہان آباد پہ اس فوج نے ستم ڈالا

نزولِ رحم کے بدلہ میں آ بلا ہے گا عتاب
سزا عمل کی ملی ہو گئے جو تھا نہ خراب

نظر اُٹھا کے جسے دیکھا تھا وہ چشم پہ آب | مٹا ہے نام و نشاں اب یہاں کا مثلِ حباب

ہے ذکر کیا جو کوئی آرزو بھی بر آوے
جو موت آئے تو وہ دیکھ اُن کو پھر جاوے

نکلتے کاش کے دہلی سے یہاں نہ رہنا تھا | بلائیں سہتے نہ کچھ پُربیوں سے کہنا تھا
نہ پاس اپنے زر و نقد تھا نہ گہنا تھا | نصیب اپنے لئے تھے ستم یہ سہنا تھا

کہ خاک چھانیں ہر ایک قریہ کی پھریں در در
نہ پوچھے بات کوئی دیکھ بے زر و بے پر

کہاں وہ شوکت و حشمت کہاں وہ جاہ و وقار | کہاں وہ سلطنت و رفعت وہ عظمتِ سرکار
کہاں وہ قدرت و ثروت وہ عیشِ لیل و نہار | کہاں وہ فرحت و عشرت وہ صحبتِ دلدار

بچا ہے یاس ہے حرماں ہے چشم پرنم ہے
فغاں ہے آہ ہے نالہ ہے جوشِ ماتم ہے

ستم کہ بادِ مخالف خزاں کو لاتی ہے | بیان کیا کروں اس کا کہ پھٹتی چھاتی ہے
جو اہلِ قلعہ تھے ثروت یہ اُن کی جاتی ہے | کہ ساتھ اُن کے یہاں سب کی شامت آتی ہے

ہمارا سینہ و دل چاک ہو گیا افسوس
یہ کیسا لاکھ کا گھر خاک ہو گیا افسوس

رہی کسی کو فراست نہ فہم و دانائی | جو سرورانِ حکومت سے جنگ ٹھہرائی
خمار جاتا رہا ہے قضا نے پلوائی | حصول کچھ نہ ہوا جز ملال و رسوائی

ہوئے ہیں جمع جو نا اہل و نابکار و کمین
بلا میں ڈال کے سب کو نکل گئے بیدین

بیان کیا کروں اس کا کہ جاں ہے گھبرائی
کہ مو شگافی سوا کچھ نہیں ہے دانائی
بلا پہ آئی بلا پر اُٹھیں نہ موت آئی
جنھوں نے دہلی میں شاہی بھی نام کی پائی

نزول جب ہو بلا کا نہ کیوں زمین ہل جائے
جو چاہے اُن کی ترقی وہ خاک میں مل جائے

تھے ایک دو فراہم جو شاہ کے فرزند
کی عرض شہ سے کہ اقبال آپ کا ہو بلند
دعا قبول ہوئی آپ کی ملی یہ گزند
خفا گلو ہے ہمارا اجل ہے طوق کمند

ہمارے حق میں جو ارشاد تھا سو پیش آیا
کہ اپنے سامنے سب کو عدم میں بھجوایا

اُجڑ گیا چمن آرائے گلرخاں افسوس
رہا نہ گلشن و گل اور باغباں افسوس
وہ نا قدر تھا کہوں کیسا قدرداں افسوس
کہ جس کی یاد میں کرتا ہے اک جہاں افسوس

چلی ہے باد خزاں ہے خزاں کی طغیانی
خدا ہی جانے کہ آفت ہے اور کیا آنی

قدیم سے جو یہاں تھے امیر اب ہیں غریب
حوادث ایسے ہیں برپا کہ ہیں کمال عجیب
اب اُن کو بیٹھنے دیوے نہ کوئی اپنے قریب
کہ جن کے در پہ رہا کرتے تھے ہزار نقیب

نہ سمجھے کو وہ بلا جو یہاں ہے ٹوٹ پڑا
یہ آسمانِ ستم لو یہاں ہی ٹوٹ پڑا

چھپے زمیں میں عبرت ہے جو کہ تھے انساں
مراد جن سے ہے انسان کی وہ اب ہیں کہاں
ملے ہزار جتن سے گر اُن کا نام و نشاں
سو وہ بھی ایسا کہ ہو جیسے چشمۂ حیواں

بشر کی شکل میں سیرت نہیں ملی ان کو

برائے نام ہیں کہتے ہو آدمی جن کو

کہاں وہ تاج کا مالک کہاں ہے وہ دربار   کہو کدھر گئی دیوانِ خاص کی وہ بہار
اب اس کے دیکھے جو اجڑے ہوئے در و دیوار   یہ دل میں آئے کہ سر پھوڑ اور چیخیں مار

ہے پارہ پارہ جگر، کیسی دل لگا رہی ہے
بجائے اشک جو آنکھوں سے خون جاری ہے

بنا ہوا تھا جو مہتاب باغ کا گلشن   گل شگفتہ ہے عندلیب وہ نہ چمن
کہاں وہ نرگسِ شہلا ہے نسترن نہ سمن   روا ہے اب کہیں اس کو کہ ہے وہ دشتِ محن

چمن سے سرو کو آزاد کر نکال دیا
گلے میں قمری کے دیکھا کہ طوق ڈال دیا

صبا چمن میں اڑائے ہے اپنے سر پہ خاک   جہاں تھی نرگس و لالہ نہیں خس و خاشاک
ہر ایک گل جو ہے پژمردہ با دلِ غمناک   کیا ہے گلشنِ ہستی نے اب گریباں چاک

کریں ہیں نوحہ مچا شور بلبلانِ چمن
ملے ہیں خاک میں گلچین و گلرخانِ چمن

وہ کیا ہوئے جو یہاں تھے امیر ابنِ امیر   تھی جن کی شوکت و عظمت ہر ایک کی توقیر
جبینِ عجز جھکاتے وہاں صغیر و کبیر   سمجھ کے فخر کھڑے رہتے در پہ جم غفیر

یہ کیسا پردۂ ناموس چاک چاک ہوا
ملے وہ خاک میں دل سب کا جل کے خاک ہوا

کہاں ہا وہ دماغ ان کا اور وہ سروار   کہ جن کو بات کے کرنے سے آتی تھی عار
نظر اٹھا کے جو دیکھیں تو ہوتا دلبر یار   لبِ در ان کو بلانا تھا کس قدر دشوار

وہ مضطر ہو کے جو باتیں کسی کے سات کریں
کرے نہ بات کوئی اُن سے جب وہ بات کریں

ہمیشہ عطر جو پوشاک میں لگاتے تھے — بدلتے شام و سحر جوڑے اور بساتے تھے
تھی نکہت ایسی کہ اُس سے نہ تاب لاتے تھے — خجل ہو گل کفِ افسوس ملتے جاتے تھے

وہ دیکھو پیراہن آلودہ خاک پھرتے ہیں
کہاں ہیں جیب و گریبان چاک پھرتے ہیں

گلے میں پھولوں کا کنٹھا سدا پڑا رہتا — اور عطرِ گل بھی پھر اُس پر جدا لگا رہتا
وہ زلف نافہ مشک اُس سے وہ کھلا رہتا — شمیمِ عطر گریباں میں دل پھنسا رہتا

اب اُس گلو میں ہے طوقِ رسن بجائے سمن
ہے چاک چاک گریباں ہر ایک غنچہ دہن

جو نازک ایسے اٹھاتے نہ گل کو جان کے بار — بجز نسیمِ گل اُن کے گلے میں تھا نہ ہار
رہا نہ عطر ہی باقی نہ زلفِ عنبر بار — چلے ہیں سر پہ رکھے اپنے بار نصف نہار

وہ پا برہنہ ہیں کانٹے ہیں اور ہے رہِ سنگ
پڑے ہیں چھالے جنھیں بار تھا حنا کا رنگ

قدم جو رکھتے نہ تھے فرش پہ پلنگ سے اُتر — برہنہ پا وہ گلی کوچوں میں پھریں در در
جگر کے ٹکڑے ہیں دیکھ اُن کو با دلِ مضطر — ستم یہ ایسے ہوئے تھے کہو بھلا کس پر

بجائے عیشِ شب و روز اُس کا رونا ہے
اب اُن کو فرشِ زمیں خاک کا بچھونا ہے

وہ نازنیں کہ نزاکت بھی دیکھ گھبراوے — کہ جن کی بسترِ گل پہ سے نیند اُڑ جاوے

گمان میں جو نہ ہو کیا خیال میں آوے | لکھا ازل کا جو تقدیر سامنے لاوے

پکڑ کے زلف کیا قتل اُن کو سنگے سر
صبا کے چھونے سے ہوتے جو تھے پریشاں تر

اب اُن کا حال ہے ایسا خدا نہ دکھلاوے | مصیبت ایسی کسی پر کبھی نہ اب آوے
رہائی جب کہ نہ قید حیات سے پاوے | صدا آرزو وہ ہے کاش جان نکل جاوے

نہ دیکھی ہے کبھی آئی نہ ایسی حیرانی
فلک نے اُن کو جو دی ہے گی اب پریشانی

برہنہ پا کوئی نکلا کوئی گریباں چاک | کسی کا دیدہ گریاں کسی کے سر پر خاک
ہر ایک بید سا لرزاں تھا با دلِ غمناک | تھی دشمنوں کی بھی ہر سمت سے یہ اُن پر تاک

قدم نہ اُٹھتا تھا جو وہ قدم اُٹھاتے تھے
ہزاروں ٹھوکریں کھاتے تھے گرتے جاتے تھے

وہ کون ہے جسے اس درد کا نہیں آزار | بشر وہ کونسا ایسا ہے جس کے دل کو قرار
طپاں ہے جان بنالہ ہائے آتشبار | لگیں ہیں آہ کی وہ برچھیاں جگر ہے فگار

جو صبر دیویں تو یعقوب ار کو دیویں
ہمارے حال کو ایوب دیکھ رو دیویں

زمانہ کوچ کا بس آگیا ہے وقتِ رحیل | قیامت آنے میں ہرگز نہ اب ہے ڈھیل
جو نفخ صور لیے ہاتھ میں ہے اسرافیل | ہے کس میں جان کہو کیا کریں گے عزرائیل

حدوثِ حشر سے پہلے ہے اپنا کام تمام
قیامت آئی اگر بعد اپنے تو کس کام

رواں ہے اشک کا دریا نہیں مجالِ سخن
وہ قدرداں کہاں سمجھیں جو کمالِ سخن
گئے زمیں میں تھا جن سے احتمالِ سخن
عبث ہر ایک سے کیجے نہ قیل و قالِ سخن

لگا کے مُہر دہن کو نہ فکر کر سوزاں
کسی سے بات نہ کیجے کہ ہے جگر سوزاں

ہزار شکر وہ آئے ہی حاکم دوراں
کہ جن کے عدل سے بیکار تیغ و تیغِ زباں
غریب آن بسے پھر وطن میں ہو شاداں
خزاں میں از سرِ نو ہے بہار کا ساماں

فلک یہ عدل سدا اُن کا پائدار رکھے
قرار ایسا اُنھیں دے نہ بیقرار رکھے

ایضاً تاریخِ غدر مفسدانِ باغی

یہ ابتدائی بلا تھی جو پوربی لائے
تھی سولھویں رمضان کی جو شہر میں آئے
اخیر مصرع میں تاریخ و سال کو پائے
جو اُس کو دیکھے وہ آنکھوں سے خون بہائے
ہے جوشِ گریہ سے یہ حال چشمِ سائل کا
جو قطرہ اشک کا ٹپکے سو ہے لہو دل کا
۱۲۷۴ھ

شاطر۔ میر اکرام الدین مرحوم۔ دہلوی

کوئی عالم میں نہیں شہر بسانِ دہلی
ہے مٹے پر بھی سوا عرش سے شانِ دہلی
پہلے رونا تھا اُنھیں تو فلکوں کا اور اب
بن گیا اور فلک دودِ فغانِ دہلی
طعنہ کیوں دیتی ہے اے بادِ بہاری اس کو
تجھ سے بہتر ہے ابھی تک تو خزانِ دہلی
نہ تو دل کہنے میں ہے اور نہ قابو میں زباں
پوچھ مت ہم سے کہ ہم اور بیانِ دہلی

غدر کو تیغ نہ سمجھوں تو بھلا کیا سمجھوں — دل پہ آتا ہے نظر زخمِ زبانِ دہلی

اہلِ جنت سے نہ باتوں میں ملا لطف ہمیں — نہ سُنی جبکہ وہاں ہم نے زبانِ دہلی

پہلے بہتر تھا جوانوں سے ہر ایک پیر جواں — اور اب پیر سے بدتر ہیں جوانِ دہلی

چمن خلد بڑھانا تھا الٰہی منظور — باغِ دُنیا میں نہ رکھا جو نشانِ دہلی

دیکھنا چشمِ حقارت سے نہ اس کو شاطرؔ

ہے مٹے پر بھی سوا عرش سے شانِ دہلی

شایقؔ. آغا مرزا مرحوم. دھلوی

فغانِ دہلی میں ان کو مرزا داغؔ کا بھائی اور شاگرد لکھا ہے کسی تذکرے میں ان کے حالات نظر سے نہیں گزرے۔

بود از دیرِ فلک دشمنِ جانِ دھلی — کہ چنیں کرد بہ ایں شوکت و شانِ دہلی

دل بغم چشم بخوں لب بفغانِ دہلی — وائے بر خستگی خستہ دلانِ دہلی

اہلِ دہلی نہ پسندند چو خلدِ فردوس — قدسیاں آمدہ بردند مکانِ دہلی

جن و انسان و ملک چوں بدو عالم ہستند — ہمہ در حلقۂ غم ماتمیانِ دہلی

بہ یمن بود یکے حاتمِ طائی مشہور — فخرِ حاتم شدہ اکثر بلبیانِ دہلی

ہر کہ مقبول شدہ ظاہرِ او گشت خراب — یافت ہرگز نہ کسے رازِ نہانِ دہلی

رونقِ بزمِ جہاں بود بہارِ دہلی — زینتِ باغِ جہاں گشت خزانِ دہلی

ماتمِ ہمنفساں شغلِ دلِ افگار ما نیست — واقعی اینکہ ہمیں است بیانِ دہلی

خامہ فرسائیٔ بیہودہ نہ شاید شایقؔ — کیست ہم پایہ کدامی ست نشانِ دہلی

شمشیر۔ میر شمشیر علی مرحوم دہلوی

کیسے کیسے ہوئے برباد مکانِ دہلی — نہ رہے ہم نہ رہا نام و نشانِ دہلی
رحم آیا نہ تجھے ای فلکِ کین پرور — کیونکہ برباد کیئے تو نے مکانِ دہلی
ہوئیں برباد جو مشہور عمارات تھیں یاں — نام کے واسطے باقی ہے نشانِ دہلی
مومن و غالب ذوق اور ظفر تھے بے مثل — جن کی اُردو سے معلے تھی زبانِ دہلی
ہفت اقلیم کے سلطان تھے اس کے مشتاق — ایسے بے مثل بنائے تھے مکانِ دہلی
بندی یاں کے جو تھے سارے جہاں کے اُستاد — سب وہ برباد ہوئے پیر و جوانِ دہلی
خاص بازار جو تھا قلعہ معلےٰ کے قریب — وہاں تھی ہر جنس سے معمور دکانِ دہلی
اب نہیں نام کو وہاں کوئی عمارت باقی — ایسے بے نام ہوئے سارے مکانِ دہلی
ای فلک ڈر کہ جگا وین نہ عدم میں فتنے — خوگر جور ہیں سب پیر و جوانِ دہلی
آسماں چال ہی چوکا جو مٹایا اس کو — لامکاں ہوکے بڑھی عزت و شانِ دہلی
خلد میں دل کہیں گھبرائے نہ ان کا رضواں — حوریں ایسی ہیں کہاں جیسے بتانِ دہلی

جو ازل میں تھا لکھا وہ ہوا سب کو درپیش
کرنہ شمشیر بیاں ابتو فغانِ دہلی

شیفتہ۔ عظیم الدولہ سرفراز الملک محمد مصطفےٰ خاں مظفر جنگ مرحوم دہلوی

خاندان بنگش کی یادگار ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ۱۸۵۵ء میں حج بیت اللہ اور زیارت روضہ نبوی سے مشرف ہوئے ۱۸۶۹ء میں جبکہ زندگی کے باسٹھ سال ختم ہوچکے تھے

دہلی میں انتقال ہوا اور درگاہ حضرت نظام الدینؒ اولیا کے جوار میں دفن ہوئے ان کی ایک کلیات جو فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے ۱۹۱۶ء میں کلیات شیفتہ و حسرتیؔ کے نام سے نہایت آب و تاب کے ساتھ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوئی ہے۔ فارسی میں حسرتیؔ تخلص فرماتے تھے۔

ہائے دہلی و زہے دل شدگانِ دہلی
آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی

وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں
مٹ گئے پر بھی یہ باقی ہے نشانِ دہلی

کل یوم ھو فی شان کی ہے جلوہ گری
کیا ہوا گر نہ رہی شوکت و شانِ دہلی

تھیں جو انہار بہشتی کی حکایت نہریں
وہی نہریں ہوئیں اب شاہ رگ ِانِ دہلی

گر نکھیں کہ یہ دلی ہے تو ہر گز نہ پڑے
دلی والوں کو بھی دلی پہ گمانِ دہلی

دلی اب ہے تنِ بیجاں۔ تنِ بیجاں کیا خاک
جان سے جا چکے جو لوگ تھے جانِ دہلی

کس لئے پردے سے نکلے "ارم ذات عماد"
ابھی موجود ہیں دو چار مکانِ دہلی

ربع مسکوں سے زیادہ ہے بہت وسعت میں
چاندنی چوک کہ واقع ہے میانِ دہلی

صورتیں ہو گئیں معنی جسد ارواح ہوئے
بے خبر کہتے ہیں ویراں ہے جہانِ دہلی

رند پر یہاں کے کریں رشک ثقاتِ امصار
بادشاہوں پہ کریں ناز شبانِ دہلی

دل قدح۔ بادہ محبت۔ گل و ریحاں عرفاں
کچھ نئے رنگ کے ہیں بادہ کشانِ دہلی

پیر خوش رائے اگر ہیں تو جواں ہیں خوش رو
عجب انداز کے ہیں پیر و جوانِ دہلی

شیفتہ اور ستایش کے نہیں ہم خواہاں
یہی بس ہے کہ کہیں "ہے یہ زبانِ دہلی"

صابر شاہزادہ مرزا قادر بخش مرحوم دہلوی

بسکہ بیداد سے ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی
ہو رقم خطِ شکستہ سے بیانِ دہلی

لامکاں ہو گئے لوٹے سے مکانِ دہلی
بڑھ گئی عرشِ معلےٰ سے بھی شانِ دہلی

یہ وہ جا ہے کہ دکھاتی تھی سدا حشر کو راہ
چشمِ نقشِ قدمِ راہ روانِ دہلی

جس طرف دیکھیے اللہ ہی نظر آتا ہے
بڑھ گئی اور بھی ویرانی سے شانِ دہلی

موجزن اشکِ مسلسل ہیں گلی کوچوں میں
پا بزنجیر ہوئے سرو روانِ دہلی

طالعِ خفتہ کو ہوتا ہے فسانہ۔ اُن کے
کیوں یہ کرتے ہیں فغاں غمزدگانِ دہلی

خلد تھی ان کی گلی عرشِ بریں بام اُن کا
دعویدارانِ خدائی تھے بتانِ دہلی

نہ رکھا چرخ نے رہنے کا وسیلہ کوئی
کیا فرشتوں کو بسائے گا میانِ دہلی

وہ گریزاں ہوئے سب اور یہ ترکش میں رہے
تھے مگر تیر و کماں پیر و جوانِ دہلی

اس کا سایہ تھا سعادت کا کبھی سرمایہ
تھا ہما سے بھی سوا زاغِ بیانِ دہلی

لوٹ سے اور بھی بازار ہوا گرم اس کا
صاف ہے صورتِ آئینہ مکانِ دہلی

مر گئے تو مرے ہیں نہ زندوں میں نہیں دم باقی
عدم آباد میں بستے ہیں کسانِ دہلی

اُن کے اُٹھنے سے یہاں بیٹھنے کو جا نہ رہی
ہند میں ظلِ الٰہی تھے شہانِ دہلی

وہ ہوئے غم سے سفید اور یہ تشر کے باعث
ایک عالم میں ہیں سب پیر و جوانِ دہلی

بسکہ گلزار ہے زخموں سے تن ایک عالم کا
بن گئی موسمِ گل فصلِ خزانِ دہلی

اہلِ دہلی کی سیہ بختی کا غم ہے صابرؔ
کہ سیہ پوش ہیں سب ظروفِ[1] میانِ دہلی

صفیرؔ دہلوی

کیا آسمان آج بد عنوان ہو گیا
عالم تمام غرقۂ طوفان ہو گیا

[1] دہلی میں ظروفِ گلی عموماً سیاہ بنتے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے۔

یہ تہلکہ ایک حشر کا سامان ہوگیا
اس غم کا پار سینہ سے پیکان ہوگیا
دلی سا شہر ہائے ہے ویران ہوگیا

یہ شہر بعد مکّہ کے شرف البلاد تھا
یہ شہر جملہ شہروں میں مثلِ سواد تھا
ساکن ہر ایک اس کا بہشتی نژاد تھا
ہر کوئی وصلِ یار کی مانند شاد تھا
تھا باغ اب اُجڑ کے بیابان ہوگیا

اک ہو وہ شہر جس میں نہ تھا درد و غم کا نام
رہتا تھا جس میں زہرہ جبینوں کا ازدحام
شمس و قمر بھی جس کے سلامی تھے صبح و شام
جس کا سدا تھا فضلِ سعادت سے التزام
اب موردِ نحوستِ کیوان ہوگیا

ہے یاسمیں ہی غم سے نہ کچھ زرد اور زبوں
سوسن بھی پیٹ پیٹ کے ہوتی ہے نیلگوں
لالہ کے دل پہ داغ ہے پیتا ہے اپنا خوں
اور گل کا جیب چاک تو غنچہ ہے سرنگوں
نرگس کو اس کے سوگ میں یرقان ہوگیا

اس شہر کا تو ماہ کے دل پر بھی داغ ہے
ماہی کو کب تڑپنے سے ہر دم فراغ ہے
تھا عشرتِ بہشت سے اب رشکِ راغ ہے
تھا آشیاں ہما کا وہ اب صرفِ زاغ ہے
عاشق کے دل کی طرح سے ویران ہوگیا

وہ تخت گاہِ خاص کہ عالم میں مشتہر
ستارۂ فلک بھی جس کا سلامی تھا ہر سحر
وہ سلطنت کہ مرجعِ شاہانِ نامور
وہ قلعہ جو حصارِ فلک سے بلند تر
تاراج اب بعرصۂ یک آن ہوگیا

یوں آسماں کی اس کو نظر کھائے حیف ہے
مانندِ مالِ مفت کے لٹ جائے حیف ہے
یوں دفعتاً ورق یہ الٹ جائے حیف ہے
رونے کا یہ مقام ہے اور ہائے حیف ہے

کیوں یہ جہازِ غرقۂ طوفان ہو گیا

ناموس اور ننگ کا تو نام تھا کہاں
بے پردہ و حجاب تھیں نیکو سیر زناں
شیطاں کی طرح ٹوٹتے تھے جن پہ بے ایماں
وہ حال جس سے مانگے قیامت بھی الاماں

دلّی سا شہر حشر کا میدان ہو گیا

جاتا رہا وہ مسجدِ جامع کا امتیاز
جس میں کہ تھی فرشتوں کو سجدے کی حرص و آز
تھی کعبہ کی مثال جہاں پنجگاں نماز
کیا پوچھتے ہو کیا کہیں تقدیرِ بے نیاز

اب وہ مکان صرفِ کرسٹان ہو گیا

یہ کیا ستم ہے چرخِ ستمگار ہائے ہائے
کیسا مٹا دیا ہے یہ گلزار ہائے ہائے
صرفِ زیاں ہے صورتِ بیمار ہائے ہائے
گر گر رہے ہیں سب در و دیوار ہائے ہائے

غم سے سحر کا چاک گریبان ہو گیا

خوبوں سے کیا ہوئے وہ خدا رنگ چہچہے
پژمردہ ہو گئے یہ شجر ہائے! لہلہے
موقوف ایک لخت ہیں یاروں کے قہقہے
جاتے رہے ضمیر کے بھی اب وہ چہچہے

اب ہمصفیرِ بلبلِ نالاں ہو گیا

ضمیر مرزا مصطفےٰ بیگ مرحوم دھلوی

کس کے آگے میں کروں آہ بیانِ دہلی
چڑھ گئے دار پہ سب پیر و جوانِ دہلی
پست تھی شانِ فلک دیکھ کے شانِ دہلی
غیرتِ خلد تھا ہر ایک مکانِ دہلی
چوک میں نہر جو واقع ہے تو پوچھ اس کی نمود
مثلِ جنت کے رواں ہے یہ میانِ دہلی
منتخب سارے جہاں کی تھی ہر اک جنس یہاں
رشکِ بت خانۂ چینی تھی دکانِ دہلی

خاک میں مل کے یہ معلوم ہوا ہم کو ضمیر
نظرِ خصمِ فلک تھی نگہبانِ دہلی

طالب نواب احمد سعید خاں مرحوم دہلوی

رئیس دہلی اور جاگیردار لوہارو تھے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ کلام غیر مطبوعہ چھوڑا۔

دلی والوں کی زباں پر ہے بیانِ دہلی
اور فلک پر ہیں ملک مرثیہ خوانِ دہلی

بارے آباد ہوا پھر کے جہانِ دہلی
بنتے جاتے ہیں جو ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی

شہر دہلی تھا عجب رشک وہ خلدِ بریں
ہمنشیں تجھ سے کروں خاک بیانِ دہلی

فتنۂ غدر کو ہنگامۂ محشر کہیئے
نالۂ صور سے ملتی ہے فغانِ دہلی

سارے عالم میں پھرا اور سنی سب کی زباں
پر نہ طالب نے کہیں پائی زبانِ دہلی

ظاہر لالہ رام پرشاد آنجہانی۔ دہلوی

کیوں نہ آوارہ پھریں عمزدگانِ دہلی
کہ ہے عنقا کے نشیمن میں نشانِ دہلی

جھولیاں کیوں نہ بھریں دعیانِ دہلی
کہ عجب طرح کی زرخیز ہے کانِ دہلی

بارِ منت سے بھلا کس کا نہیں سر نیچا
کس کے سر پر نہیں احسانِ شہانِ دہلی

کوئی ظاہر میں نہ تھا اس کی خرابی کا سبب
اپنے اعمال ہوئے آفتِ جانِ دہلی

کس قرینے سے تھی آراستہ ہر جنس کی چیز
چمنستان تھی گویا کہ دکانِ دہلی

صبح پیری کے تھی کافور سے اس کو نسبت
گل رخسار جو رکھتے تھے جوانِ دہلی

رشکِ طوبیٰ قد و بجو رُخِ انور خورشید
ماہِ نو تھا خمِ ابروئے بتانِ دہلی

بند ہو جاتے ہیں شیرینیٔ الفاظ سے لب
کیا زباں کھول سکیں مدعیانِ دہلی

میرے نزدیک تو جب دادِ فصاحت کی ملے
دہن اللہ کا ہو اور زبانِ دہلی

نظر آتی نہیں صورت کوئی آسایش کی
پنجۂ مرگ میں ہو جانِ کسانِ دہلی

اک فلک اور بنا میرے ستانے کے لیے
جب اُٹھا دل سے مرے نالہ و فغانِ دہلی

ایسی تصویرِ بتاں کو جو بگاڑا اے چرخ
کیا دلِ عاشقِ شیدا تھے مکانِ دہلی

گھر ادھر گاہ اُدھر پھرتے ہیں دن بھر ظاہر
بن گئے سایۂ دیوارِ مکانِ دہلی

ظفرؔ حضرت سراج الدین بہادر شاہ مرحوم و مغفور بادشاہ دہلی

۲۰ شعبان ۱۱۸۹ھ م ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ م ۲۸ مئی ۱۸۳۷ء میں تخت نشیں ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں قید کرکے کلکتے بھیجے گئے۔ ۴ دسمبر ۱۸۵۸ء کو رنگون بھیج دیئے گئے۔ دو بیویاں ایک لڑکا اور ایک پوتا ان کے ساتھ تھے۔ ایک لاکھ روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء میں وہیں انتقال ہوا۔ ذوق مرحوم کے شاگرد تھے۔ ضخیم کلیات مطبوعہ ان سے یادگار رہے۔

کیا پوچھتے ہو کجروی چرخِ چنبری
ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستم گری

کرتا ہے خوار تر اُنھیں جن کو ہے برتری
اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری

کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

بالعکس ہیں زمانہ میں جتنے ہیں کاروبار
شیوہ کیا ہے اُلٹا زمانہ نے اختیار

ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجب روشِ باغِ روزگار

جو نخل پُر ثمر ہیں اُٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

بادِ صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دمبدم کفِ افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں بھی فریادِ دردناک

شاداب حسبِ خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

نزدیک اپنے آپ کو جو کھینچتے ہیں دور
دیکھا تو صاف۔ فہم میں اُن کے ہے کچھ قصور
ورنہ جو باصفا ہیں خردمند ذی شعور
کیا دخل اُن کو آوے کبھی نخوت و غرور

رکھتے غبارِ کینہ سے وہ سینہ صاف ہیں
ہر نیک و بد سے صورتِ آئینہ صاف ہیں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہووے گا سر پہ چرخ بھی جاویں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں
چھٹنا محال اُس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آگیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں

یہ گنبدِ فلک ہے عجب طرح کا قفس
طاقت نہیں ہے نالہ کی بھی جس میں یک نفس
جنبش ہو ایک پر کو تو پر ٹوٹ جائیں دس
رہ جائے دل کی دل میں کس طرح سے ہوس

کیا طائرِ اُمید کی پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ پر باز کر سکے

کیا کیا جہاں میں ہو گئے شاہانِ ذی کرم | کس کس طرح کے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم | دارا کہاں کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم

کوئی نہ یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

ظہیر سید ظہور الدین مرحوم دہلوی

اصلاح الدولہ مرصع رقم خان بہادر سید جلال الدین خوش نویس اُستاد ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے صاحبزادے تھے۔ راقم الدولہ کا خطاب تھا ۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصہ تک اخبار جلوۂ طور کی ایڈیٹری کی ۴ سال تک مہاراجہ الور کے یہاں رہے اس کے بعد ۱۹ سال تک ریاست جے پور میں پولیس کی ملازمت پر ممتاز رہے ۱۶ برس نواب احمد علی خاں رونق کی عزت افزائی سے ریاست ٹونک میں وظیفہ خوار رہے۔ آخر عمر میں حیدر آباد گئے۔ مگر سر مہاراجہ کشن پرشاد کی مقرر کردہ رقم یعنی چالیس روپے کے یا بعض دیگر عمائدین کی مالی اعانت کے پائے گاہ آصفی سے فیضیاب ہونے کی عزت نصیب نہ ہو سکی اور باوجود شرف باریابی کے آٹھ مہینے کی اُمیدواری کے بعد حیدر آباد میں ۱۷ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء انتقال ہوا۔ دائرہ میر میں آپ کا مزار ہے۔

فرشتہ مسکن و جنت نشان تھی دہلی | زمیں کے پردے میں اک آسمان تھی دہلی
جہاں میں ایک عجائب مکان تھی دہلی | غرضکہ اہل بصیرت کی جان تھی دہلی

یہ وہ جگہ تھی زمیں جس کی زر اُگلتی تھی
یہ خاک وہ تھی کہ اکسیر ہاتھ ملتی تھی

سوادِ ہند میں عرش احتشام تھی دہلی | بیاضِ مردمکِ خاص و عام تھی دہلی

زمیں پہ چرخ کی قایم مقام تھی دہلی | جب آیا عہدِ جوانی تمام تھی دہلی

قتال کہ جس کو ملائک نے انتخاب کیا
ستم ہے اس کو زمانہ نے یوں خراب کیا

یہ شہر وہ تھا کہ غنچہ تھا حسن والوں کا | یہ شہر وہ تھا کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مجمع تھا خوش جمالوں کا | یہ شہر وہ تھا کہ مرجع تھا باکمالوں کا

یہ وہ مکاں تھا مکیں جسکے قیصر و جم سے تھے
یہ خطہ وہ تھا گدا جس کے فخرِ حاتم تھے

جہاں آباد لقب تھا نہ شاعراں کے لیئے | جہاں کا لفظ بنا تھا اسی مکاں کے لیئے
یہ درجے اس کے لیئے تھے نہ آسماں کے لیئے | کہ اس سے کام زمانہ نے دو جہاں کے لیئے

فلک سے رتبہ میں دوچند تھا اس کا
مقامِ عرش سے پایہ بلند تھا اس کا

نقوشِ پیکرِ ارژنگ تھے در و دیوار | نگار خانۂ چینی تھے کوچہ و بازار
مکاں مکاں سے ہویدا تھا جوشِ فصلِ بہار | بنا محلہ محلہ تھا غیرتِ گلزار

فلک صفائے عمارت پہ زہر کھاتا تھا
چمک سے ذروں کی خورشید تھرتھراتا تھا

دلِ جہان تھا دلی سے مدعا ہی ہے | نہ سمجھے دل میں تلنگانِ پُرجفا ہی ہے
کہ دل کو بولتے ہیں خانہ خدا ہی ہے | خدا کے گھر کو بگاڑا ستم کیا ہی ہے

نہیں جہان میں واللہ اس جفا کی پناہ
جو انتقام ہو اس کا تو بس خدا کی پناہ

یہ وہ الم ہے کہ اس غم سے سب ہلاک ہوئے
ہلاک گور میں آسودگانِ خاک ہوئے
لگا کے چرخ سے بےچین تا سماک ہوئے
کفن بھی ساتھ گریباں کے چاک چاک ہوئے
نہ روزِ حشر سے کم تھی عذاب کی صورت
خدا دکھائے نہ اس انقلاب کی صورت

نہ غم سے دیدۂ نرگس میں اشکِ شبنم ہے
چٹکنا غنچہ کا گلشن میں نالہ و غم ہے
دُرِ سرشک سے چشمِ صدف بھی پُرنم ہے
تمام خانۂ گیتی سرائے ماتم ہے
جو دل خراش ہے شیون سے نغمہ بلبل کا
جو پرزے پرزے گریباں ہے باغ میں گل کا

جو رشکِ دیدۂ نرگس تھی چشمِ فتانی
گھڑی گھڑی ہے فزوں آنسوؤں کی طغیانی
ہوئی ہے گریہ خونیں سے لعلِ رُمّانی
غرضکہ کشتی اہلِ جہاں ہے طوفانی
نہ ناخدا ہے نہ ملاح نہ کنارا ہے
خدا کی ذات کا اس بحر میں سہارا ہے

گلی گلی سے ہے آتی صدائے واویلا
دُکاں دُکاں سے ہے گھر گھر سے حشر ہے پیدا
زمیں زمیں سے ہے اُٹھتی نوائے وادردا
مکاں مکاں سے اُٹھا غلغلہ ہے شیون کا
چہار سمت رواجِ ستم پرستی ہے
فلک سے تازہ بلا پر بلا برستی ہے

زمیں میں کے دبے ہیں خاک اُڑانے کو
رہی نہ جائے زمانہ کے سر اُٹھانے کو
مکاں مکان کے ڈھنڈے ہیں کاٹ کھانے کو
ٹھکانے ڈھونڈھتے فتنہ ہیں بیٹھ جانے کو
گھروں کو دیکھ بگڑتے لگے ہیں گھر عبرت

بنے ہیں روزنِ دیوار دیدۂ حسرت

ہوئی جو شام تو شامت دلوں کی شامت ہے
نمودِ صبح قیامت پر اک قیامت ہے
بلا بلا پہ مصیبت پہ اک مصیبت ہے
گھڑی گھڑی ہے غضب لحظہ لحظہ آفت ہے

ترے ستم سے کہاں بچ کے پُرجفا جائیں
زمین شق ہو تو اب چرخ ہم سما جائیں

لباس ہے جو بدن پر اجل کا ساماں ہے
کہ آج گل سر و ساماں بھی دشمنِ جاں ہے
جو پُرزے پُرزے سلاسل کی شکل داماں ہے
تو بند بند ہیں طوقِ گلو گریباں ہے

بہارِ لالہ و گل اشکِ خوں دکھاتے ہیں
بجائے خندۂ لب زخم مسکراتے ہیں

جو ہاتھ عقدہ کشا تھے وہ بستہ کار ہوئے
جو قد کہ رشکِ صنوبر تھے وہ نزار ہوئے
جو پاؤں غیرتِ گل تھے وہ خار خار ہوئے
حنائی تلوے دلوں کی طرح فگار ہوئے

جو سینے گلشنِ خوبی تھے داغ داغ ہوئے
جو دل کہ خانۂ عشرت تھے بے چراغ ہوئے

نگاہ صورتِ تصویر رہ گئی حیراں
ہر ایک جسم بنا شکلِ قالبِ بے جاں
چھٹے یگانوں کے ہمراہ ہوش و تاب و تواں
برنگِ طائرِ پر بستہ اُڑ گئے اوساں

مثالِ آئینہ ہر ایک چشم حیراں تھی
دلوں کی طرح سے جو زلف تھی پریشاں تھی

ہر ایک دولتیٔ بزمِ جہاں قتل ہوا
ہر ایک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیٔ شیریں زباں قتل ہوا
ہر ایک بلبلِ نوشیں بیاں قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سروساماں — وہ چاک چاک گریباں لگا کے تا داماں
وہ جانا پردہ نشینوں کا با سرِ عریاں — وہ دار و گیرِ سپاہِ بغیٔ بے ایماں

درازیِ دستِ تظلم ستم شعاروں کا
فلک کو پاس سے تکنا جفا کے ماروں کا

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے — ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے — قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے

کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمینِ شہر نے ایک ایک کے پاؤں پکڑے ہیں

وہ دھوپ اور وہ ریگِ تپاں وہ گرم ہوا — وہ فوج فوج ہر ایک سو سے نرغۂ اعدا
وہ کینہ دوزیِ غارت گرانِ بے پروا — اور اس پہ ظلم گنواروں کا اور واویلا

جو ہم سے سنتے ہیں اس انقلاب کی باتیں
تو لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے — وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگر میں الم سمائے ہوئے — جفا کی تیغ سے سب زخم دل پہ کھائے ہوئے

وہ داغِ مرگِ عزیزاں وہ دشت پیمائی
وہ ریگ خارِ مغیلاں وہ آبلہ پائی

گلوں سے جسموں پہ ایک مردنی سی چھائی تھی — وہ مہ سے چہروں پہ گویا چھٹی ہوائی تھی

غضب وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی
غرضکہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی
بیان کیجیے نصیبوں کی کیا بُرائی کا
وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی
سنانِ نیزہ ہر ایک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کی ہار ہوئی
ہر ایک سمت سے فریادِ گیرودار ہوئی
ہر ایک دشتِ قضا میں کشاں کشاں پہونچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہونچا

نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے
گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا زوال ہوئے اور کیا کمال ہوئے
کمال کو بھی نہ پہونچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطرِ گل کا ملتے تھے ملے وہ مٹی میں
جو فرشِ گل پہ تھے چلتے ملے وہ مٹی میں

کہاں وہ خسروِ عالی نظر بہادر شاہ
کہاں وہ سروِ نیکو سیر بہادر شاہ
کہاں وہ بادشہِ دادگر بہادر شاہ
کہاں وہ داورِ والا گہر بہادر شاہ
کہاں سے باغیِ بے دین آ گئے ہے ہے
کہ نام اُس کا جہاں سے مٹا گئے ہے ہے

جہاں میں جتنے تھے اوباش و رندِ نافرجام
قمار باز و چنڈو خور و بدمعاش تمام
ہوئے شریکِ سپاہِ شریر و بدانجام
کیا تمام شریفوں کے نام کو بدنام
دو چند آتشِ فتنہ کو سر بلند کیا
کیا وہ کام کہ عالم کو دردمند کیا

شریر و مغوی و نا اہل سر اُٹھانے لگے ۔ کہ گمرہوں کو رہِ گمرہی دکھانے لگے
چھپے ہوؤں کا سُراغ و نشاں بتانے لگے ۔ پکڑ پکڑ کے ستمگار خوں بہانے لگے

اُٹھائی گیرے اُچکے گھروں سے دھر بھاگے
جو گٹھ کٹے تھے وہ گٹھڑی لپاکے گھر بھاگے

بدی کے تخمِ شقی کشتِ دل میں بونے لگے ۔ کہ بے گناہ زن و بچہ قتل ہونے لگے
جو اہل درد تھے رو رو کے جان کھونے لگے ۔ مسیح و خضر بھی منہ ڈھانپ ڈھانپ رونے لگے

ستونِ خانۂ نصفت گرا دیئے یکسر
چراغِ بزمِ عدالت بجھا دیئے یکسر

نہ دیندار تھا کوئی نہ دینداری تھی ۔ ستم پرستی و جور و جفا شعاری تھی
یہ پاسداریِ ملت تو مستعاری تھی ۔ پر اس کے پردے میں فکرِ حرام کاری تھی

غرض کہ دین کو سمجھے تھے وہ ستمگاری
نمک حرامی و محسن کشی تھی دینداری

برائے نام ستمگار دیندار بنے ۔ جو دیندار بنے تو ستم شعار بنے
ستم شعار بنے جب تو ذی وقار بنے ۔ جو ذی وقار بنے تو حرام کار بنے

کیا وہ ظلم کہ سر پر جہاں اُٹھا مارا
خدا پرست نہ تھا کیا کوئی خدا مارا

یہ کیسی آتشِ فتنہ لگا گئے ظالم ۔ جہاں میں ایک قیامت مچا گئے ظالم
غرضکہ نامِ خلافت اُٹھا گئے ظالم ۔ سبھوں کو مٹنے سے پہلے مٹا گئے ظالم

کسی پہ قہرِ خدا کا نہ آفت آئی تھی

یہ خاندانِ ثمرؔ پر قیامت آئی تھی

ہزار شکر کہ دورانِ دور گو پر ہے
زمانہ عہد میں اُس کے ترقیوں پر ہے

وہ آسمانِ کرم کا مہِ منور ہے
سخی و سرور و ذی جاہ و داد گستر ہے

اگر نہیں تو نہ ہو بندگی و خاوندی
اُسے درست تو ہے نسبتِ خداوندی

ظہیر بیہدہ تا چند خامہ فرسائی
خیالِ ہرزہ درائی و بادہ پیمائی

عبث عبث یہ نکالو و آبلہ پائی
نہیں پسند نہیں تیری نغمہ آرائی

زباں کو بند کر اور منہ سے کچھ نکال نہ بات
مثل سُنی بھی ہے تو نے گزشتہ را صلوات

ایضاً

بل بے دہلی و زہے شوکت و شانِ دہلی
لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی

مل گئی خاک میں سب شوکت و شانِ دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی

ای فلک اپنے گریبان میں منہ ڈال ذرا
ہائے یہ ظلم و ستم اور کسانِ دہلی

وہ قیامت ہیں فرشتوں کو لٹا دیتے ہیں
شوخ و بدمست فسوں کار بتانِ دہلی

نام کوثر کا نہ لو حضرتِ واعظ دیکھو
چوس جائیں نہ کہیں دُکشانِ دہلی

زمزمے بھول گئے نغمہ طرازانِ چمن
ہے ہر ایک نوحہ گر و مرثیہ خوانِ دہلی

رہ گئے کہنے کو کچھ ہیں فسانے باقی
اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

فلکِ پیر نے مٹی میں ملایا سب کو
پھرتے ہیں خاک بسر پیر و جوانِ دہلی

ہیں نئے ڈھنگ نئے رنگ نئی گفت و شنید
ایک عالم سے نرالا ہے جہانِ دہلی

دلربا مہر لقا ماہ جبیں دشمنِ دیں
کیا قیامت ہیں طرحدار بتانِ دہلی

ایک سے ایک طرحدار نظر آتا ہے
عالم آشوب ہیں یہ کج کلہانِ دہلی

چرخ بد بیں یہ غضب ہے نہ انھیں دیکھ سکا
چند اشخاص تھے باقی جو نشانِ دہلی

کیوں نہ پامال ہو مردہ ہے بدستِ زندہ
جسم دوزخ میں ہے فردوس میں جانِ دہلی

خوش متاعِ سرِ بازار ہے ارزِ بازار
جوہر فرد ہے کل جنسِ دکانِ دہلی

بولتے ہیں جسے اردوئے معلیٰ احباب
ایہا الناس ہے وہ خاص زبانِ دہلی

رات دن گریہ ہے اور سنگ ہے اور سینہ ہے
اور ظہیرِ جگر افگار و بیانِ دہلی

عابد سید حسین علی خاں مرحوم دہلوی

سالک دہلوی کے شاگرد تھے۔

ہم نے مانا کہ ملی خاک میں شانِ دہلی
ڈھونڈیے اب بھی کوئی شہر بسانِ دہلی

فاقہ مستی اسے کہتے ہیں کہ غارت ہو کر
پھر اسی رنگ میں ہیں پیر و جوانِ دہلی

کرتے ہیں لوگ جو دلی کے ارم کی باتیں
حوریں سنتی ہیں بصد شوق زبانِ دہلی

خونِ دل پیتے ہیں اور شکرِ خدا کرتے ہیں
یوں بسر کرتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

جنسِ حسرت کے سوا کچھ نہ رہا اب باقی
لٹ گئی غدر میں افسوس دکانِ دہلی

غالب و شیفتہ و نیر و سالک ثاقب
جسم دہلی ہے تو یہ لوگ ہیں جانِ دہلی

توبہ کی عشق سے کب حضرتِ عابد تم نے
سر ہے توبہ شکن جبکہ بتانِ دہلی

عاصیؔ۔ نواب غلام حسین خاں مرحوم دہلوی

جنتی لوگوں سے حُسن کے بیانِ دہلی
حوریاں کرتی ہیں جنت پہ گمانِ دہلی

عرش تک پہونچ گئے غمزدگانِ دہلی
عرش سے فرش تلک ہے جو فغانِ دہلی

غور کی جا ہے جو دل میں کوئی انصاف کرے
میرؔ اور دردؔ کی ہے صاف زبانِ دہلی

جبر حاکم سے جو نکلے تھے سبھی شہر کے لوگ
پا پیادہ تھے مگر تھے نگرانِ دہلی

دلی سے جو کہ نہ رکھتے تھے قدم باہر کو
دربدر وہ ہی ہیں نواب و خانِ دہلی

منہدم چرخ نہ اس شہر کو کیونکر کرتا
ہفت اقلیم کی تھا جانِ جہانِ دہلی

عاقلؔ نواب ضیا علی خاں مرحوم دہلوی

کیا کروں کس سے کروں آہ بیانِ دہلی
جان بن کر گئے جو لوگ تھے جانِ دہلی

جن کا مذکور سُننے سے بھی غش آجاتا تھا
کیا ہوئے ہائے خدایا وہ بتانِ دہلی

دیکھ لیں گے ارم خلد کو بھی آخر ہم
شہر تو کوئی نہیں دیکھا بشانِ دہلی

باعثِ شان تھے جو لوگ سو وہ ہی نہ رہے
اب یہی کیا ہے جو دیکھے ہے نشانِ دہلی

حضرتِ دہلی کے باشندے ہیں جن سے عاقلؔ
گلشنِ خلد پہ رکھتے ہیں گمانِ دہلی

عباسؔ۔ میر عباس مرحوم دہلوی

نقشۂ خلد تھا گویا یہ مکانِ دہلی
نہ مٹا ہے نہ مٹے نام و نشانِ دہلی

کیا ہی برباد ہوا باغِ جہانِ دہلی
چشمِ حسرت سے ہے نرگس نگرانِ دہلی

اہلِ دہلی کو تو حب الوطنی نے مارا
لیئے رہے دے کے درمِ داغ زبانِ دہلی

چشمِ بد بیں کی نظر کر گئی کام آخرِ کار
ایک مدت سے فلک تھا نگرانِ دہلی

ہمارے جتنے تھے اس شہر کے برباد ہوئے
خونِ دل کیوں نہ پئیں بادہ کشانِ دہلی

کچھ نہ ہاتھ آیا مگر ایک غمِ بے وطنی
لے گیا دہلی سے ہر پیر و جوانِ دہلی

اور کیا اس سے فلک قہر زیادہ کرتا
کہ ہوا پردہ درِ حسنِ بتانِ دہلی

مثلِ دہلی کے کہیں نقشہ نہ دیکھا ہم نے
ہے مگر روضۂ رضواں پہ گمانِ دہلی

عزیز راجہ یوسف علی خاں مرحوم دہلوی

کیجے ای ہمنفسو خاک بیانِ دہلی
کہ فقط نام کو باقی ہے نشانِ دہلی

آ نکلتے ہیں سلامت رہے ملکِ پنجاب
نازنینانِ پری چہرہ میانِ دہلی

اس قدر نازشِ بیجا نہ کر ای فصلِ بہار
تجھ سے اس وقت بھی بہتر ہے خزانِ دہلی

غم سے ساکت ہیں جو باتیں نہیں کرتے سب سے
ورنہ کیا بن گئے پتھر کے بتانِ دہلی

ختم یہ بات ہے اس شہر پہ ہم ہیں منصف
صاف شفاف عموماً ہے زبانِ دہلی

شیفتہ ہے یہ جواں تم پہ کہے اس گل سے
کوئی اتنا بھی نہیں دوست میانِ دہلی

قبرِ عشاق پہ استادہ ہیں کھولے ہوئے بال
نخلِ ماتم ہے ہر ایک سروِ روانِ دہلی

جامِ مُل ہو سبو گل نغمہ و دیوانِ خاص
ابرِ دُربار ہو اور بحرِ روانِ دہلی

سو برس اُس طرف ای وحشت ہر قصرِ خراب
رشکِ فردوس تھا ہر ایک مکانِ دہلی

کی تھی اجداد نے گلگشت بصد جاہ و حشم
ہم کو تقدیر نے دکھلائی خزانِ دہلی

دل کی تڑپن ہی زبس آفتِ جانِ مضطر
لے لے اس کو کوئی اب آفتِ جانِ دہلی

یوں تو اللہ کی قدرت کا ہی جلوہ ہر جا
پر جنھیں کہتے ہیں بُت وہ ہیں بتانِ دہلی

نشۂ ہر چند ہرن ہی پہ غزل کیا لکھئے
جائیے انصاف ہی ای بادہ کشانِ دہلی

سُنتے ہیں گردشِ افلاک نے غصہ جو کیا
جا بسے خلد میں سب حور وشانِ دہلی

یہ بھی تاثیر ہی ایک دورِ قمر کی ورنہ
ہم کہاں اور کہاں ماہ وشانِ دہلی

کیا بیاں کیجئے ای کوچۂ جاناں تجھ سے
کوئی آباد نہ تھا شہرستانِ دہلی

للہ الحمد کہ حکام کو ہی خلق پہ رحم
ورنہ رہتا نہ کہیں نام و نشانِ دہلی

ہو چکی سمع خراشی بہت اب ہو خاموش
ای عزیز اب نہیں بہتر ہی بیانِ دہلی

عزیز مرزا یوسف علی خاں مرحوم دہلوی

جنتی دیکھ کے کہتے ہیں خزانِ دہلی
ہی بہارِ چمنِ خلد از آنِ دہلی

دہلی ایک سیفِ مفصل ہی کہ ہی شہر پناہ
حفظِ دہلی کے لیئے طرفہ میانِ دہلی

یاں نہ ذکرِ ملکوت اور نہ بیانِ لاہوت
اور ہی کچھ ہی نگاہوں میں جہانِ دہلی

اس میں کچھ تھا کہ نہ تھا لیک بھرم تھا کتنا
غدر نے کھولدیا رازِ نہانِ دہلی

عقل چکرائے گی کہتا ہوں سن ای پیرِ فلک
بھڑ گیا تجھ سے اگر کوئی جوانِ دہلی

فرض دہلی کو اگر کیجیئے جنت ہی بجا
کہ ہی یاں نہر رواں کاہکشانِ دہلی

پی پہ پی فاقہ ہی ہر روز تو روزہ کیسا
دیکھنا چاہیئے حالِ رمضانِ دہلی

بادہ جز خونِ جگر اور نہ ساقی جز رنج
نی کوئی میکدہ نی پیرِ مغانِ دہلی

نہر کا شہر میں کہتے تھے جسے زور اور شور
اب سمجھتے ہیں اُسے شورِ فغانِ دہلی

جو طلائی رُخِ خورشید پہ ہنستے تھے سدا
مل گئے خاک میں وہ سیمبرانِ دہلی

اس احاطہ میں نہیں زینتِ آبادیِ خلق
جسم بیجان ہے یہ گویا نہیں جانِ دہلی

حیف صد حیف کہ جو لوگ ستایشگر تھے
اب وُہی لوگ ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

لال ڈگی کہ بڑھی جس کے سبب رونقِ شہر
اب ہے بے نور وہ چشمِ نگرانِ دہلی

بند ایسے ہیں درِ شہر کہ کھلتے ہی نہیں
کہیے کیونکر نہ اُنھیں گوشِ گرانِ دہلی

خاص بازار نہیں چوک نہیں قلعہ نہیں
کیوں ہے اس شہر پہ خلقت کو گمانِ دہلی

چاندنی چوک کا میداں کہ پر از نعمت تھا
خاک اُس میں نہیں خالی ہے وہ جانِ دہلی

کیوں عزیز اب وہ کہاں قدرِ متاعِ خوبی
خاک آباد ہے دُنیا میں مکانِ دہلی

عیش حکیم آغا جان مرحوم دہلوی

خاندانی اور بادشاہی طبیب تھے۔ شیریں کلام اور خندہ پیشانی تھے۔ میاں ہدہد کو پال کر انھوں نے سب سے بگاڑ لی۔ کیونکہ وہ اُستادوں پر حملے کرنے لگے تھے۔ انھوں نے خود بھی مرزا غالب کے خلاف اجمیری دروازہ کے مشاعرہ میں ایک "قطعہ پڑھا تھا جس کا آخر مصرعہ یہ تھا ع۔ مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔

عجیب طرح کی باغ و بہار تھی دہلی
جہاں میں غیرتِ صد لالہ زار تھی دہلی

ریاضِ قدرتِ پروردگار تھی دہلی
غرض گلِ چمنِ روزگار تھی دہلی

وہ وہ تھی ابرِ گہر بار جس کو کہتے تھے
وہ وہ تھی گلشنِ بے خار جس کو کہتے تھے

بیان اس کے کروں لطف کیا میں نامِ خدا — وہ قطعہ روئے زمیں پر بڑا معظم تھا
کہیں اگر اسے فردوس ننگ ہے اس کا — نسیمِ خار سے بہتر تھی واں کی آب و ہوا

مشامِ جان کو بس فرحت اس سے آتی تھی
ہر اک بشر کی مزا روح اس سے پاتی تھی

مریضِ غم کے لیئے شفا خانہ شفا تھی وہ — جہاں میں دردِ دل و جان کی دوا تھی وہ
جو خاک بھی تھی وہاں کی تو کیمیا تھی وہ — بھلا میں کیا کہوں تم سے کہ چیز کیا تھی وہ

زمیں وہاں کی شرف آسماں پر رکھتی تھی
فلک کی آنکھ بھی حسرت سے اس کو تکتی تھی

عجیب طرح کے تھے اس کے کوچہ و بازار — ہمیشہ تھا آئینہ پر اس کا ہر در و دیوار
اور اس صفائی پہ تھا ایسا لطفِ نقش و نگار — بعینہ جیسے کہ آئینہ میں کھلے گلزار

لگا رہے وہاں اہلِ نظر کا دیدۂ دل
نہ ہووے اور طرف دیکھ کر اسے مائل

عمارتیں تھیں وہاں کیسی کیسی شانوں کی — بیان کیجئے کیا خوبی اُن مکانوں کی
تھی اہلِ دیدہ کو وہ فرح بخش جانوں کی — انھیں بھی دیکھ کے چرخ عقل آسمانوں کی

زمیں بھی تھی تو وہاں کی اس آب و تاب پہ تھی
کہ جس کے ذرہ کو بھی چشمک آفتاب پہ تھی

ہر ایک ذرہ وہاں کا تھا رشکِ صد خورشید — وہ جائے اہلِ نظر کے لیئے تھی قابل دید

جو عالم اُس کا تھا وہ تو نہ دیکھا نہ شنید
جہاں میں قفلِ درِ آرزو کی تھی وہ کلید

ہر ایک طرح کا واں انبساط حاصل تھا
وہ طبقہ باعثِ آرامِ دیدۂ دل تھا

وہ کیا جگہ تھی طلسمات کا سا عالم تھا
مدام فصلِ بہاری کا واں تو موسم تھا
بھرا ہوا وہ خوشی سے مکان ہر دم تھا
نہ دل تھا ایسا کوئی واں کہ جو نہ خرم تھا

ہر ایک فردِ بشر کو خوشی سے کام تھا واں
نجانتا کوئی زنہار غم کا نام تھا واں

ہوا وہاں کی تھی بس مشکبار عنبر بیز
ہر ایک دل کو تھی فرحت فزا طرب انگیز
ہر ایک موج تھی اس کی خوشی سے واں لبریز
تھی جان و دل کے لیے اُس کی نکہت عشرت خیز

لطافت ایسی تھی واں کی ہوا میں نامِ خدا
کہ جس کے لطف کو کہتی سے تھے دیکھ صلِّ علےٰ

بسانِ آئنہ اس سوچ میں میں حیراں ہوں
کہ اُس مکان کو تشبیہ دوں تو کس سے دوں
خلافِ ادب کے ہے باغِ جناں جو اس کو کہوں
عجیب قدرتِ حق سے تھی وہ جگہ موزوں

کہ جس پہ روضۂ رضواں کو رشک آتا تھا
اور اُس کو خلدِ بریں دیکھ غار کھاتا تھا

وہاں تھا مجمعِ اہلِ کمال و اہلِ ہنر
وحیدِ عصر تھا واں کا ہر ایک فردِ بشر
رکھے تھا ہمتِ عالی ہر اک بلند اختر
کسی کو فیض ہو تھا اُن کو یہ ہی مدِ نظر

ہر ایک طرح کا وہاں فیض اُن سے جاری تھا
ہر ایک شخص پہ القصہ فضلِ باری تھا

وحید عصر تھے جو اہل علم و فضل و کمال
جہاں میں دولت ہنر سے تھے وہ مالا مال
ہر ایک عقدہ کو ہر ناخن ان کا تھا حلال
اور ان کمالوں کے تھے ساتھ صاحب اقبال

زمیں کی سطح پہ فیض ان سے اک جہاں کو تھا
زمیں پہ ان کے سبب رشک آسماں کو تھا

زبان ویسی ہی اہل زبان ویسے ہی
مکین ویسے ہی تھے اور مکان ویسے ہی
فصیح ویسے ہی تھے خوش بیان ویسے ہی
خدا کے فضل سے ذی عز و شان ویسے ہی

ہر ایک طرح کا صاحب کمال تھا اس میں
ہر ایک صاحب حسن و جمال تھا اس میں

ہر ایک چیز میں اس شہر کی لطافت تھی
اور اہل شہر کی ہر وضع میں شرافت تھی
طبیعتوں میں نفاست تھی اور لطافت تھی
ہر اک سخن میں لطیفہ تھا اور ظرافت تھی

غرض وہاں کا تھا ہر خاص و عام ویسا ہی
جہان میں تھا وہ خطہ تمام ویسا ہی

شب برات کی مانند واں کی تھی ہر رات
ہر ایک روز مشابہ تھا روز عید کے ساتھ
ہر ایک شخص تھا واں نیک ذات و نیک صفات
اب ہو گئی وہ جگہ ایسی مورد آفات

کہ اس کا نام بھی لینے سے خوف آتا ہے
خیال بھی واں جانے سے منہ چھپاتا ہے

وہ بارگاہ کہ تھا جس کا عتبہ بوس فلک
طواف کرتے تھے جس گھر کا مہر و ماہ تلک
جہاں میں اس کی تھی عظمت سما سے تا بسمک
پہونچتا حد تک اس کی تھا فخر حور و ملک

تباہی ان کی سنانا قابل بیان نہیں

کہوں تو کیونکہ کہوں طاقتِ زبان نہیں

فلک نے ان کے وہ آپس میں تفرقے ڈالے
پھنسے ہیں اُن کے سب آفت میں بوڑھے و بالے
دل و جگر پہ پڑے پڑتے غم کے ہیں بھالے
اور اُن کو اس پہ بھی جینے کے ہیں پڑے لالے

خبر نہ جان کو دل کی نہ دل کو جان کی ہے
اور اُس پہ ویسے ہی چھیڑ اب تک آسمان کی ہے

وہاں پہ جتنے ہوئے ذوالاقتدار تھے جو جو
متین و صاحبِ عز و وقار تھے جو جو
یگانہ و شرفِ روزگار تھے جو جو
زمیں پہ باعثِ صد افتخار تھے جو جو

فلک نے اُن ہی کو چن چن کے پائمال کیا
اُنھیں کو موردِ صد رنج و صد ملال کیا

اب اس میں دل کو ہے مثلِ آئینہ کے حیرانی
کہ اس طرح کی لطافت جہاں تھی ارزانی
بسانِ زلف ہے خاطر کو یہ پریشانی
یہ دل ہے کہتا ہوں سن سن کے واں کی ویرانی

الٰہی خواب تھا یا وہ خیال تھا - کیا تھا
وہ واقعی تھا کہ یا احتمال تھا - کیا تھا

فلک کی آنکھ نہ تھی جن کو دیکھنے پاتی
خدا نے دی تھی اُنھیں ایسی عصمتِ ذاتی
نہ تھی مجال صبا کی جو اُن تلک جاتی
کہ نامِ غیر جو سنتے تو اُن کو شرم آتی

فلک نے بخشا ہے اُن کو لباسِ عریانی
ہے ستر اُن کے لیے اُن کی پاک دامانی

غرض فقط میری اس داستان سے یہ ہے
مراد اُن کی بس اظہارِ شان سے یہ ہے
مآلِ کار میرا اس بیان سے یہ ہے
حصولِ شرح مکین و مکان سے یہ ہے

کہ ایسے ایسے مکین و مکاں خراب کیئے
فلک نے سب دل و جان و جگر کباب کیئے

وہ دل ہی کونسا اس غم سے جو خراب نہیں
وہ جان کونسی ہی جس کو اضطراب نہیں

وہ کون شخص ہی جو گردِ پیچ و تاب نہیں
اب آگے حال کے لکھنے کی مجھ کو تاب نہیں

کروں ہوں ختم دعا پر درِ قبول ہی وا
خدا سے عرض ہی اب یہی الٰہی صبح و مسا

الٰہی کر دے پھر آباد باغِ دہلی کو
مئے نشاط سے بھر دے ایاغِ دہلی کو

کر اپنے فضل سے روشن چراغِ دہلی کو
دلوں سے خلق کے تو دھو دے داغِ دہلی کو

دعا ہی تجھ سے یہی ای مسبب الاسباب
کہ اپنے ابر کرم سے وہ باغ پھر شاداب

انھیں مکینوں سے پھر وہ مکان ہوں آباد
رکھ امن میں اُسے اور اُس کی آل اور اولاد

الٰہی عیشِ جگر خستہ کا بھی کر دل شاد
بحقِ سید کونین و آلہ الامجاد

پھر اُس کو ویسا ہی آباد کر خدائے کریم
بحقِ سورۂ یٰسین و سورۂ تحم

ایضاً

کیا کہوں میں فلکِ شعبدہ گر کی نیرنگ
متحیر ہیں سن اس حال کو اہلِ فرہنگ

دیکھ کر اُس کے طلسمات سنا عقل ہی دنگ
اُن پہ کیا سن کے ہی اس ظلم سے ہر ایک دل تنگ

شمع ساں سب کو کیا خاک جلا کر اُس نے
چھوڑا بس خاک میں ایک ایک کو ملا کر اُس نے

نہیں ایسا کوئی دل جو نہیں اس غم سے دوچار
سن کے اس حال کو سینہ نہیں ہے کس کا فگار
کس کے دل میں نہیں اس غم کا ہے بتلاؤ تو خار
کون ایسا ہے جو اس غم سے نہیں زار و نزار
کونسا دل ہے جو اس غم میں گرفتار نہیں
کونسی آنکھ ہے اس غم سے جو خونبار نہیں

ڈالا اوقات میں اُن اہل کمالوں کے خلل
قول کو جن کے سمجھتے تھے یہ قولِ فیصل
عقدے حل ہوتے تھے جن پاس کہ مالا ینحل
اُن کی کیونکر نہ ہو حالت متغیر پل پل
دل سے بے چین ہیں خاطر سے پریشان ہیں وہ
کچھ میسر نہیں ہر چیز سے حیران ہیں وہ

اور سوا اس کے ہیں جانوں کے بڑے اندیشے
ڈر سے جانوں کے لگے کرنے وہ ارزل پیشے
دل پہ پڑتے ہیں پڑے اُن کے غموں کے تیشے
جوتیاں بیچے ہے اُن میں کا کوئی میشے[1]
اس پہ بھی چین نہیں جان کو بیتابی ہے
اُن کی قسمت میں فقط بے خور و بے خوابی ہے

ابرِ غم دل پہ ہر شخص کے ایسا چھایا
اُن کا اس چرخِ ستمگر کو یہ عالم بھایا
چرخ نے اُن پہ سنا غم کا یہ مینہ برسایا
یاں تلک لٹ گئے کہ بس منہ کو کلیجا آیا
اشک ان کے اب آنکھوں سے پڑے جھڑتے ہیں
اور سات اُن کے یہ کٹ کٹ کے جگر گرتے ہیں

تھے وہ جن باغوں میں اقسام کے میوے پرنور
اور اسی قسم کے میووں سے چمن تھے معمور
ناشپاتی و بہی سیب و انار و انگور
اُن کی بو باس سے ہو جاتا تھا خفقان بھی دور
یا انھیں باغوں میں ہیں چار طرف خاک کے ڈھیر

[1] بھیڑ بکری کی کھالیں

اور گل و غنچہ کی جا ہیں خس و خاشاک کے ڈھیر

دیکھ ہاں سبزے کا اور آبِ رواں کا عالم   اور ہی ہوتا تھا واں پیر و جواں کا عالم
جمع ہوتا تھا وہاں ایک جہاں کا عالم   کچھ بیاں ہو نہیں سکتا ہے وہاں کا عالم

یا وہاں کانٹوں کے اب ڈھیر میں اور پتے ہیں
تھے جہاں پھول نجاست کے وہاں [illegible] ہیں

جس جگہ رہتے تھے پریوں کے اکھاڑے دن رات   مہوش کرتے تھے واں سیر لیے ہاتھ میں ہات
اور ہر طرح کی موجود تھیں اُن کو نعمات   جز خوشی سننے میں آتی نہ تھی اُس جا کچھ بات

یا وہی جا ہے کہ انسان کا وہاں نام نہیں
اور جو ہے کوئی تو بس غم کے سوا کام نہیں

وہ پری زاد جنھیں دیکھ کے جان آتی تھی   نام سے اُن کے سدا روح مزا پاتی تھی
بیٹھے بیٹھے جو طبیعت کبھی گھبراتی تھی   اُن سے ملتے تھے تو فوراً یہ بہل جاتی تھی

خاک میں اُن کو ہر اک طرح ملایا اُس نے
ہم جگر سوختوں کو اور جلایا اُس نے

وہ نہ جو پاؤں نزاکت سے زمیں پہ دھرتے   بات بھی کرتے کسی سے تو اشارے کرتے
اُن سے کچھ چھیڑے بھی کہتے تھے تو ڈرتے ڈرتے   مرد و زن پیر و جواں دم تھے سب اُن کا بھرتے

خاک اب چھانتے پھرتے ہیں وہ صحراؤں میں
اور ستم اس پہ کہ چھالے ہیں پڑے پاؤں میں

جامِ عشرت سے سدا رہتے تھے دن رات جو مست   اور جو موجود وہاں رہتے تھے سب بادہ پرست
بزم میں اُن کی سدا اہلِ طرب کی تھی نشست   ہاتھ اُٹھائے تھی وہ سب [illegible] کے دست

اب وہ غم کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں
خاک جیتے ہیں مگر کہنے کو ہاں جیتے ہیں

تھا وہ جن لوگوں کے ہاتھوں کی نزاکت کا یہ حال
خواب مخمل سے کفِ پا کو تھا ہاں اُن کے ملال

بارِ سے رنگِ حنا کے وہ ہوئے جاتے تھے لال
ہنستے ہوتے تھے نظر کرتی تھی وہ چاند سے گال

اب وہی لوگ ہیں اور بادیہ پیمائی ہے
مل گئی خاک میں سب میری وہ رعنائی ہے

جن کو موجود تھی جمعیتِ خاطر ہر دم
اور آرام سے شیرازۂ خاطر تھا بہم

خوابِ راحت سے نہ تھی جن کو کہ فرصت ہر دم
کیا کروں عیش میں اُن لوگوں کا احوال رقم

یعنی اب لطف ہے وابستہ اُن سے پریشانی کو
آئینہ لیتا ہے مول اُن سے ہی حیرانی کو

ایضاً

مل گئی خاک میں شانِ دہلی
نہ رہا نام و نشانِ دہلی

نہیں برباد ہوا کوئی مکاں
آہ دنیا میں بیانِ دہلی

ہو گیا کیا کہوں پامالِ ستم
ہائے ہے ہر ایک مکانِ دہلی

دشتِ غربت میں پھرے چھانتے خاک
یوں فلک پیر و جوانِ دہلی؟

گردِ کلفت ہوئے افسوس افسوس
غازۂ ماہ رخانِ دہلی

شان و شوکت ہوئی اُن کی برباد
جن سے تھی شوکتِ شانِ دہلی

کیا ہوا فائدہ اے چرخ تجھے
سچ بتا کر کے زیانِ دہلی

دیکھا کبھی تھی جسے چشمِ فلک
کھا کے سوگند بجانِ دہلی

دوسرا گلشنِ دنیا میں چمن نہیں ہر سبز بسانِ دہلی
سو وہ ایسی ہوئی برباد کہ ہیں بلبلیں مرثیہ خوانِ دہلی
نخلبندِ چمنِ دہر کو کیا ناپسند آئی تھی آنِ دہلی
بایک قلم یوں جو کیے اُس نے قلم نخلِ اُمیدِ کسانِ دہلی
قمریاں کرتی ہیں کوکو غم میں کرکے اس طرح بیانِ دہلی
مل گئے خاک میں کیسے کیسے ای فلک سرو قدانِ دہلی
عندلیبانِ چمن ہیں نالاں یاد کر غنچہ لبانِ دہلی
پہنی سوسن نے ہے نیلی پوشاک کھا غمِ یاسمنانِ دہلی
پیچ کھاتی ہے یہ سنبل کر یاد زلفِ پُر پیچ بتانِ دہلی
لالہ ہو داغ یہ دل کرتا ہے یادِ خالِ پریانِ دہلی
یاد کر کرکے ہے نرگس حیراں نگہِ خوش نگہانِ دہلی
خوں بدل شام و شفق ہے کر یاد زیبِ لب مسّی دہانِ دہلی
گل کھلایا یہ نیا عالم میں بل بے نیرنگِ خزانِ دہلی
اب کہاں ہے وہ کلامِ شیریں ہے کہاں اب وہ زبانِ دہلی
پیشہ ور ایسے کہاں ہیں پیدا جیسے تھے پیشہ ورانِ دہلی
مل گئے خاک میں سب اہلِ کمال مرمٹے قاعدہ دانِ دہلی
الغرض چرخ جفاکار نے آہ خوانِ یغما کیا خوانِ دہلی

دل بھر آتا ہے خاموش ہو علیشؔ
تجھ سے سن سن کے بیانِ دہلی

ایضاً

کیا جانے اہلِ دہلی سے کیا بات ہو گئی — جو دہلی ایسی موردِ آفات ہو گئی

تھی رات واں کی دن سے بھی روشن زیادہ تر — یا وہ ہی ہے کہ دن کی وہاں رات ہو گئی

ہر شب شب برات تھی ہر روز روزِ عید — یا اب وہ جا محلِ مکافات ہو گئی

یہ واردات دہلی کی وہ ہے کہ یاں تو کیا — مشہور تا بسیع سماوات ہو گئی

جو سرزمیں کہ مسکنِ قدسی صفات تھی — اب اس طرح وہ وقفِ بلیات ہو گئی

نقشِ قدم کی طرح سے سب خاک میں ملے — لو اب وہ جائے دفنِ اموات ہو گئی

مت پوچھئے بگڑنے ہی دہلی کے کیا کہیں — کیا واردات خلق پہ ہیہات ہو گئی

دیکھا بقولِ حضرت سودا تو عیش بس
دنیا تمام بزمِ خرابات ہو گئی

ایضاً

حالِ عالم آہ کیف و کم میں کیا تھا کیا ہوا — یا اولی الابصار دیکھو دم میں کیا تھا کیا ہوا

جائے عبرت ہے کہوں کیا تم سے ای اہلِ نظر — دفعتاً دیکھو تو رنگ عالم میں کیا تھا کیا ہوا

فصلِ خوردی و جوانی تو وہ گزری چمن سے — اب ہی پیری سو اس موسم میں کیا تھا کیا ہوا

جس طرح اوراق کو ہو گنجفے کے ابتری — ویسی ہی اس دورۂ عالم میں کیا تھا کیا ہوا

کیا کہوں میں تفرقہ پردازیاں اس چرخ کی — دوستوں میں اختلاط اور ہم میں کیا تھا کیا ہوا

ای دلِ ناداں تو اب اس بات کا شاکی نہ ہو — ربط باہم دیکھ جام و جم میں کیا تھا کیا ہوا

جز خداوندِ جہاں حالِ دل اپنا عیش بس
کس سے کہیے دوستوں کے غم میں کیا تھا کیا ہوا

غالبؔ۔ اسد اللہ خاں الملقب بہ مرزا نوشہ والمخاطب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرحوم دہلوی

٨ رجب ١٢١٢ھ (١٧٩٧ء) کو اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں یتیم ہوئے ١١ برس کی عمر میں اُنکے سرپرست چچا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ خاندانی جاگیر سے سات سو روپیہ سالانہ ملتے تھے پچاس روپیہ ماہوار خاندان تیموریہ کی "تاریخ" لکھنے کے معاوضے میں مع خلعت و خطاب بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے خزانے سے ملتے تھے ١٨٥٧ء میں یہ دونوں سلسلے ختم ہوگئے تو ریاست رامپور میں آئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم مرحوم ان کے شاگرد تھے انھوں نے ١٨٥٩ء سے سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ اور قیام رامپور کی حالت میں سو روپیہ ضیافت کے مقرر کر دیئے مگر مرزا مرحوم دلی چلے آئے یہاں آکر خاندانی پنشن بھی ملنے لگی۔ ١٥ فروری ١٨٦٩ء کو دہلی میں انتقال ہوا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے جوار میں "چونسٹھ کھمبا" کے قریب دفن ہوئے۔ اب ان کا مزار ایک حجرہ کے اندر جانب مغرب ہے۔ قبر کے سرہانے ایک پتھر نصب ہے۔

بس کہ فعال ما یرید ہے آج ۔۔۔ ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے ۔۔۔ زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ۔۔۔ گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک ۔۔۔ تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک ۔۔۔ آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا ۔۔۔ وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ ۔۔۔ سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ۔۔۔ ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب | کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

ذیل کا قطعہ بھی مرزا صاحب نے انہیں حالات سے متاثر ہو کر لکھا ہے

قطعہ

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس | یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے | یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

فرحت۔ کنور کشن پرشاد آنجہانی دہلوی

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حالی سے خوار ہے | کوئی بےکسی میں اداس ہے کوئی رنج سے تہ بار ہے
جسے دیکھو آہ زمانہ میں وہ الم سے زار و نزار ہے | ہے کوئی قلق سے شکستہ دل کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اٹھائے لوگوں نے غم پہ غم نہ حساب ہے نہ شمار ہے

ہوا چرخ دل میں کچھ خجل گیا خاک ہو کے جہانِ دل | کوئی دل ہی دل میں ہے منفعل کوئی سوزِ الم میں ہے مشتعل
جو ہیں سوزِ قلق سے شکستہ دل تو ہزاروں ہو گئے زیرِ گل | کیے جور و ظلم یہ متصل کہ زمانہ غم سے ہے مضمحل
دلِ بیکسوں کی طرف سے تو ابھی اس فلک کو غبار ہے

کیا سر بسر یہ اُجڑ جہاں ہوا انقلاب یہ نہاں | نہ وہ عیش و عشرت جاوداں نہ زمیں ہے نہ وہ آسماں
کیا تو نے کیا ارے آسماں گئے سب کے سب وہ چمن کہاں | ہوئیں اب یہ بیکسی داستاں نہ وہ گل ہے اور نہ وہ بوستاں
یہ کہاں سے آ گئی اب خزاں نہ وہ باغ ہے نہ بہار ہے

یہ اُٹھائے صد رنج و غم کہ ہیں زندگی سے بھی تنگ ہم | کیا سوزِ قلق نے بھی بند دم کوئی اور جیتے ہیں دم کے دم
کیا غدر چرخ نے ایک ظلم ہوا درد دل میں کیا ستم | رہیں کیوں نہ اشک سے چشم نم ہوا کیسا دہلی میں ہائے غم
ہمیں رونا اسی کا ہے ایک الم کہ اُجڑ گیا یہ دیار ہے

کروں کیا میں کثرتِ غم بیاں کہ الم میں بند ہوئی زباں
کہوں کس سے کون ہے رازداں مرے غم کی طول ہے داستاں
پڑا غمکدہ میں ہوں نیم جاں کوئی ہمنفس ہے نہ مہرباں
یہ بلا ہیں غم کی گرانیاں کہ ہے زندگی سے خفیف جاں
مجھے چھوڑ کر گئی ہے اجل کہاں جہاں سانس لینا بھی بار ہے

نہ تھا ان دنوں کا خیال جب وہ مزے سے گذرے تھے روز و شب
ولے کیجے دل میں غور اب تو جہاں کی طرز ہے کچھ عجب
کوئی دل میں پہنچتا تھا پر طرب کہ خوشی سے تھا خندہ لب
جو خوشی سے ہنستے تھے خندہ لب وہ ہیں غم کے ہاتھوں سے جاں بلب
پڑے یاس بیکسی الم میں سب نہ تو صبر ہے نہ قرار ہے

نہ اداس غم میں ہو اس قدر نہ قلق سے نالاں ہو ہر سحر
تجھے کچھ خبر بھی ہے بے خبر کہ یہ بخت بد کا ہے سب اثر
نہ پھر افغاں سے تو مفت سر نہ فلک کے جوروں سے نالہ کر
کہاں مان فرحتِ نوحہ گر نہ الم میں اتنا ہو چشم تر
نہیں خوب رونا یہ سر بسر کہ جگر پہ غم سے بخار ہے

قمر حکیم غلام رسول خاں مرحوم دہلوی

کیا کروں دوستو میں تم سے بیانِ دہلی
عشق میں قلعہ کے جاتی رہی جانِ دہلی
کیا ہوا مٹ گیا گر نقشۂ دِلّی یارو
شہر اب بھی کوئی ہوگا نہ بسانِ دہلی
لے گیا ہے فلکِ پیر اُٹھا کر شاید
جو فرشتوں کو ہے گردوں پہ گمانِ دہلی
نہ رہا کوئی خدایا کریں کس کی تعریف
چاندنی چوک دریبہ نہ جوانِ دہلی
چرخ بدبیں سے خدایا یہ بچیں گے کیونکر
اب یہ باقی جو ہیں دو چار جوانِ دہلی
سچ ہے جب تک ہوں شاگردِ قمر اہلِ اودھ
کیونکہ پیدا کریں وہ لوگ زبانِ دہلی

کامل مرزا باقر علی خاں مرحوم دہلوی

تمام گلشن عیش و سرور تھی دہلی
تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام مطلع خورشید نور تھی دہلی
تمام غیرت صد کوہ طور تھی دہلی
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکان عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہان عیش

ملک صفات تھا یاں کا ہر ایک فرد بشر
بڑا ہی یاں کا زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے عام کو تھا فوق خاص دنیا پر
یہاں کے نام سے بکتا تھا مس بھی زر ہو کر
یہ فوج باغیہ کیا شہر میں خدا آئی
کہ قہر آیا غضب آیا اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں
جو روز عیش میں گزرا تو شب مسرت میں
پڑے ہوئے ہیں وہی اب تو رنج و حسرت میں
پھنسے ہیں غم میں گرفتار ہیں مصیبت میں
وہ شاہزادے کہاں اور وہ بادشاہ کہاں
رہا جو کوئی تو وہ مرتبہ وہ جاہ کہاں

یہ قلعہ رشک دہ گلستان رضواں تھا
یہ قلعہ خلد تھا اس میں ہر ایک غلماں تھا
یہ قلعہ تھا کہ خدایا کوئی پرستاں تھا
یہ قلعہ پیکر دنیا کے واسطے جاں تھا
نہ رہنے والے رہے اور نہ وہ مکان رہا
فقط دکھانے ہی کے واسطے نشان رہا

سنے جو کوئی تو ہاں درد دل عیاں کیجے
صدائے طائر گم گشتہ آشیاں کیجے

حیات بخش کا گر ماجرا بیاں کیجے
تو چاہیئے کہ بہت نالہ و فغاں کیجے

یہ وہ جگہ ہے کہ جنت کو جس سے غیرت آئے
جو دیکھیں حور و ملک بھی کبھی تو حسرت آئے

وہ لال پردہ کہ تھا جس سے احتشام عیاں
خوشی سے خسرو پرویز ہو جہاں دربان
عوام کو تو وہاں جانے کی مجال کہاں
کہ خاص خاص بھی جاتے تھے بس تو سجدہ کناں

جھکے ہی رہتے تھے جس جائے اک جہان کے سر
قدم بھی اب نہیں دھرتا ہے واں کوئی جاکر

یہ چوک وہ ہے کہ میلہ تھا جس جگہ ہر روز
یہیں تو رہتے تھے مہ طلعتانِ دل افروز
نظر کو ہوتی تھی کیفیتِ سرور اندوز
جدھر کو دیکھئے تھی اک بہارِ کلفت سوز

نشان بھی نہیں اب تو ہجومِ خلقت کا
بنی ہے وہ ہی جگہ بس مقامِ عبرت کا

یہ وہ ہے مسجدِ جامع کہ جس میں اک جہاں
نماز کے لیئے آتا تھا دور دور سے واں
تبرکات جو اس میں تھے کیا ہو اُن کا بیاں
ادب سے کرتے تھے اُس کی زیارت اہلِ زماں

وہ اُس کی رونق بازار چار سو مت پوچھ
کہ ہم سے ہو نہیں سکتی ہے گفتگو مت پوچھ

نہ دیندار تھی یہ فوج اور نہ دینداری
سیاہ روؤں کو آتی تھی بس سیہ کاری
نہ جانتے تھے وہ کچھ بے خبر ستمگاری
حرام خوروں کو ہر دم تھا شغلِ میخواری

تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا
ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

وہ لوگ سیکڑوں ہتے تھے جن کے ساتھ سوار
کیا پیادہ اُنھیں اے سپہرِ ناہنجار
اٹھائیں سر پہ وہ گٹھری کا کس طرح سے بار
اُٹھانا ایک قدم کا بھی جن کو ہو دُشوار

تھہ زمین جگہ چاہیے اماں کے لیئے
دُعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لیئے

نہ چھپے کوئی دم اور نہ ٹھہرے کوئی آن
فسردہ دل ہیں جو کرتے تھے عیش میں گذران
ٹھکانے ہوش ہی ہیں نے بن آتے ہیں اوسان
ذلیل و خوار ہیں پھرتے ہیں جا بجا حیران

فلک نے پھینکدیا ہے کہاں کہاں اُن کو
بجائے زمزمہ ہے نالہ و فغاں اُن کو

الٰہی بھاگ کے یہاں سے کوئی کہاں جاوے
کوئی نظر میں ٹھکانا نہیں جہاں جاوے
کوئی جگہ نہیں جس جا پہ با اماں جاوے
اگر زمین پھٹے تو وہاں سما جاوے

دکھائی دیتا ہے ہر ایک عدوئے جاں اپنا
بنا ہے دُشمنِ جانی یہ آسماں اپنا

کہاں تلک کوئی اس غم کی داستاں لکھے
کہاں تلک کوئی کیفیتِ فغاں لکھے
کہاں تلک کوئی یہ دردِ خونچکاں لکھے
کہاں تلک کوئی بیدادِ آسماں لکھے

دُعائے کاملِ غمگیں ہے مستجاب خدا
بسی ہوئی نہ ہو کوئی جگہ خراب خدا

ایضاً

مٹ گیا پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی
لب پہ دہلی ہے تو نظروں میں ہے شانِ دہلی
اگلے عیشوں کا کہیں چرخ عوض لیتا ہے
اب مصیبت میں پڑے ہیں جو کسانِ دہلی

منھ کو اُبلا ہوا آتا ہی کلیجہ ہی ہی
ہمنشیں کیونکہ بھلا کیجے بیانِ دہلی

جی بہارِ چمنِ دہر پہ کیونکر دھریئے
کہ نظر آتی ہی افسوس خزانِ دہلی

غم دیئے رنج دیئے اپنی گرہ سے ظالم
چرخ کیا تو نے لیا کرکے زیانِ دہلی

اب جو تعریف کرے کوئی تو حسرت سے کہوں
تو نے پہلے بھی کبھی دیکھی بھی شانِ دہلی

ضبطِ گریہ تو یہ دلّی نے کیا ہی گویا
نہیں پائی گئی یہ نہرِ روانِ دہلی

خانۂ کعبہ کو اب حضرتِ کامل چلیئے
رہنے کا اب نہ رہا لطفِ میانِ دہلی

ایضاً

مٹ گئے سارے محل اور مکانِ دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی

سہمے سہمے نہ ہیں کیونکہ مقیمانِ فلک
کہ فلک ہی ہدفِ تیرِ فغانِ دہلی

ہم تو انسان ہیں جی کیونکہ رہے بن روئے
کہ فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

جیسے فارس میں خلاصہ ہی زبانِ شیراز
ویسی ہی ہند میں ہی پاک زبانِ دہلی

اس کی ویرانی میں اک بات یہ دیکھی ہم نے
مٹ گئے پر بھی تو باقی رہی آنِ دہلی

جسدِ چرخ نہ انجم سے بنے آبلہ دار
گر نہ ہو درپے بربادیٔ شانِ دہلی

بسکہ ہنگامہ طلب تھا یہ مکان پہلے سے
فتنۂ حشر بھی ہووے گا میانِ دہلی

جو مکیں رہ گئے بے گور و کفن مر مر کر
ڈھانپنے پردہ کرے ان پہ مکانِ دہلی

غالب و سالک و ثاقب ہی نہیں ہیں غمگیں
کوکبِ خستہ بھی کرتا ہی فغانِ دہلی

لطف — میر لطف علی مرحوم لکھنوی وارد دہلی

حیف ہے اُٹھ گئے کیا پیر و جوانِ دہلی
خاک باقی نہ رہا نام و نشانِ دہلی

چہچہے بلبلوں کے رہتے تھے دن رات جہاں
مسکنِ فاختہ ہے اب وہ مکانِ دہلی

ہر روش پر ہیں خراماں اُسی طرح سے غیر
جیسے گلگشت میں تھے سروِ روانِ دہلی

اب تو ایک ایک پہ گزر جاتے ہیں گھر میں دو دن
جو غریبوں کو دیا کرتے تھے خوانِ دہلی

رہ گیا قالبِ بے نور فقط آنکھوں میں
ملک الموت اُڑا لے گئے جانِ دہلی

سُن کے ہر طرز کو اطراف و جوانب والے
وجد کرتے تھے جو ہوتا تھا بیانِ دہلی

اس قدر گریہ و زاری میں ہیں اب پسماندہ
جس سے گردوں پہ گئی آہ و فغانِ دہلی

جلوہ گر رہ گئے ہیں چند یہاں صاحبِ دل
مثلِ خورشید وہ روشن ہیں میانِ دہلی

نور سے قدرتِ باری کے ضیا دین کو ہے
ورنہ ہیں بے حس و حرکات کسانِ دہلی

اہلِ حرفہ کے سوا چین کسی کو بھی نہیں
پھرتے ہیں سب متردد پسِ نانِ دہلی

اُٹھ گیا لطفِ محبت نہ رہا دل کو قرار
کون ہے جس کو نہ ہو نجا ہو "نکانِ دہلی

مبین — حافظ غلام دستگیر صاحب مرحوم دہلوی

پسندِ خاطرِ ہر خاص و عام تھی دہلی
طلسمِ دل کش و جنت مقام تھی دہلی

تمام ملک میں بس نیکنام تھی دہلی
گلِ خوشی سے معطر تمام تھی دہلی

اُجاڑا ایسا چمن جس کے غم سے دل ہے خوں

مٹے خزاں کی ہوا خاک میں ملے گردوں

بلا بلا پہ ہے نازل خراب ہے دہلی — تباہ ہو گئی کیسی شتاب ہے دہلی
ستم ہے مورد ظلم و عتاب ہے دہلی — ہزار حیف کہ وقف عذاب ہے دہلی

ہوا جو دیدۂ خونِ غم سے سُرخ کیا ہے عجب
کہ تارِ اشک ہے تارِ شعاعِ مہر میں اب

مثالِ خلدِ بریں بے مثال تھی دہلی — گلِ کمال سے پُر یہ کمال تھی دہلی
سپہرِ اوجِ تجلی مآل تھی دہلی — غبارِ غم سے صفا مہ جمال تھی دہلی

چمن طراز یہ دہلی فلک کو خار ہوئی
نیازِ برقِ فنا نزہتِ بہار ہوئی

یہ شہر وہ تھا نہ تھا غم خوشی کی تھی کثرت — یہ شہر وہ تھا نہ تھا رنج تھی عجب راحت
یہ شہر وہ تھا کہ کہتے تھے گلشنِ عشرت — یہ شہر وہ تھا کہ ہوتی تھی دل کو یاں فرحت

ملی وہ خاک میں صورت کہ رو رہا دل ہے
مٹی وہ شکل کہ ہر خشت فردِ باطل ہے

یہ شہر وہ تھا کہ جانِ جہاں تھا اس کا خطاب — یہ شہر وہ تھا کہ جنت نشاں تھا اس کا خطاب
یہ شہر وہ تھا کہ آرام جاں تھا اس کا خطاب — یہ شہر وہ تھا کہ گوہر فشاں تھا اس کا خطاب

کیا حوادثِ دوراں نے اس کو بھی پامال
یہ صادق آئی مثل ہر کمال کو ہے زوال

یہی تھا رشکِ جناں شہر اب ہے خارستاں — یہی تھا حسن کدہ شہر اب ہے صرفِ خزاں
یہی تھا عیش وطن شہر اب ہے جو ویراں — یہی تھا حورستاں شہر اب ہے وحشتاں

یہ شہر خلد تھا ویرانیوں کا اب گھر ہے
جسے بہار ہے اُس کو خزاں مقرر ہے

یہ وہ جگہ تھی یہاں سے قدم نہ اُٹھتا تھا
یہ وہ جگہ تھی مسافر وطن تھا نام اس کا
یہ وہ جگہ تھی کہ غم تھا نہ کوئی بھی اس جا
یہ وہ جگہ تھی کہ ہر درد کی بہم تھی دوا

ہوا کچھ ایسی چلی خاک میں ملا یہ شہر
خرابہ ہو الم آباد بن گیا یہ شہر

یہاں کا روز تھا ہر روز روزِ عید جہاں
یہاں کی شب تھی شبِ قدر ماہِ نور افشاں
یہاں کی شام تھی چوں زلفِ عنبر بتاں
یہاں کی صبح تھی ہم نورِ عارضِ خوباں

یہ دہلی وہ تھی کہ جس سے جہان روشن تھا
یہ شہر وہ تھا کہ نام اس کا نور مخزن تھا

ہر ایک شام یہاں کی تھی شامِ مشک ایجاد
یہاں کی شب شبِ راحت تھی روز روزِ مراد
یہاں کی آن تھی آن سکندرِ نوشاد
یہاں کی ہر گھڑی پُر عیش تھی طرب آباد

خدا ہی جانے اسے بد دعا لگی کس کی
کھُلا ہنسی پہ لبِ حرفِ غم مٹی یہ ہنسی

عمارتوں سے بنا تھا طلسم خانہ گھر
نہ جسم خانہ میں آتی وہاں تھے چھپکے نظر
ہر ایک خشت تھی آئینہ اور گل عنبر
بہشت خانہ تھا ہر خانہ صفا پرور

فلک نے ڈھایا ستم شہر یہ خراب ہوا
عذاب کا بھی فرشتہ یہاں پُر آب ہوا

یہاں کے لوگ تھے علم و ہنر میں سب کامل
یہ تھا وہ ملک کہ تھی اس سے جملہ شی حاصل

حکیم و شاعر و عالم مہندس و عاقل
سبھی تھے جمع یہ تھا شہر دہر کے قابل

ہزار حیف کہ بن بن کے بگڑیں تصویریں
ملیں گناہوں کی محشر سے پہلے تعزیریں

ہوا زمیں کے ماتم میں چرخ نیلی پوش
ہر ایک کوچہ بھی یہاں کا تھا حجلۂ خاموش
کہاں وہ بزمِ نشاط اور کہاں خوشی کا وہ جوش
ہر ایک دل لیے ہجومِ قلق ہے ہم آغوش

بہ فرطِ جنبشِ مژگاں سے حال روشن ہے
خوشی کا مردمکِ چشم کرتی شیون ہے

خجل تھا جن سے ہر ایک گل وہ ایسے خار ہوئے
مثال سبزۂ بیگانہ ہائے خوار ہوئے
بسانِ ابرِ گہربار اشکبار ہوئے
قرار دل کا گیا غم سے بے قرار ہوئے

وہ کم ہے ذرہ سے جو شکل آفتاب سی تھی
وہ غرقِ خوں کفِ نازک ہے جو گلاب سی تھی

یہ وہ جگہ ہے کہ جس پر برستی ہے حسرت
یہ وہ جگہ ہے کہ حیراں ہے دیدۂ حیرت
یہ وہ جگہ ہے رلاتی ہے کثرتِ عبرت
یہ وہ جگہ ہے جسے کہیے محشرِ آفت

یہ وہ جگہ ہے فرشتوں کی جان ڈرتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ دمِ مرگ جس کا بھرتی ہے

ہر ایک سو ہے یہ غارت گری سے ویرانہ
کہ مثلِ دیدۂ گریاں ہے ہر درِ خانہ
رلا رہا ہے فرشتوں کو بھی یہ افسانہ
نہ وہ ہیں گھر نہ وہ محفل نہ شمع و پروانہ

بنا ہے گنجِ شہیداں بسانِ خرمنِ گل
فرشتے نعشوں پہ اب نالہ کش ہیں جوں بلبل

جو ہائے پھولوں کے کنٹھے کو کہتے تھے بھاری ‏ ‏ انھیں نصیب ہے اطوق کرتے ہیں زاری
یہ اُن کی نازکی اور حیف قید کی خواری ‏ ‏ دموں پہ آن بنی جان سے ہے بیزاری
وہ روکے کہتے ہیں زنداں سے کیونکہ ہوں باہر
کہ ہم کو روکے ہے زنجیر پاؤں پڑ پڑ کر

فلک نے چھین لیا ہائے جان کا آرام ‏ ‏ سحر ہے شعلہ فشاں پیکرِ بلا ہے شام
وہ فتنہ زا ہے زمیں خوش نہیں ہے کوئی مقام ‏ ‏ خوشی کی کیا ہو خوشی غم سے جو کہ ہو نا کام
اُداس پھرتے ہیں کوئی خوشی نہیں بھاتی
یہ دل پہ غم ہے کہ لب پر ہنسی نہیں آتی

قیامت آئی قیامت ہے کس لئے پہلے ‏ ‏ دکھائے کس لیے قسمت نے حادثے ایسے
جو غم نہ سہنے کو جی چاہے آنکھ سے دیکھے ‏ ‏ کہاں تلک کوئی روئے کہاں تلک پیٹے
کہیں پدر ہے تڑپتا کہیں پسر بیتاب
غضب ہے تفرقہ پرداز چرخ خانہ خراب

جو انتخاب جہاں میں تھے نازنیں دلبر ‏ ‏ فلک سے کہتے ہیں دکھلا کے اپنے دیدہ تر
ستم یہ کیسا ہے یہاں نیند آئے اب کیونکر ‏ ‏ یہ سنگ خارہ کا تکیہ یہ خاک کا بستر
الٰہی خاک میں مل جائے گردشِ ایام
گھڑی گھڑی ہے قیامت کی دشمنِ آرام

جو پائے شبستانِ عیش کی لذت ‏ ‏ نہ ہو نصیبِ دل و جاں کبھی گلِ راحت
نہیں ہے رونے سے دن رات کے ذرا فرصت ‏ ‏ ٹپکتے اشک ہیں ہر دم برستی ہے حسرت
وہ طرزِ گریہ کہ روتا ہے جس پہ ابرِ بہار

وہ اضطراب کہ تڑپے ہی برق سو سو بار

گھر ایسے لُٹ کے ہوئے ہیں خراب کیا میں کہوں
کہ جیسے خشک ہیں بے اشک دیدۂ پُرخوں
نہ زر نہ سیم نہ پوشاک نے دُرِ مکنوں
لبوں پہ آتے ہیں اب نالۂ دلِ محزوں

جو دُر فشاں تھے کفِ دست ہیں حزن آگیں
گُہر جو دیتے تھے کوڑی بھی اُن کے پاس نہیں

وہ لوگ جن کے دروں پر ہجوم خلقت تھا
اور اُن کے نام سے زندہ تھا نام حاتم کا
وہ دربدر ہوئے ایسے تباہ اور رُسوا
کہیں زمین پہ اُن کو ملی نہ امن کی جا

فلک کو دیدۂ حسرت سے بھوک میں دیکھا
ہلالِ چرخ کو سمجھے وہ نان کا ٹکڑا

جو لوگ دیتے تھے زر ان کے ہارے پھیلے ہات
رُلا رہی ہے اب ایسوں کو مفلسی ہیہات
دموں پہ آن بنی اُن کے اور بگڑی بات
فقط ہے گوشۂ تنہائی میں خدا کی ذات

ہزاروں جن کے تھے نوکر اکیلے پھرتے ہیں
وہ رو کے اُٹھتے ہیں ناطاقتی سے گرتے ہیں

وہ ازدحامِ غم و یاس و حسرتِ پیہم
وہ دل ہے غمکدہ جس میں خوشی کا ہے ماتم
دکھا رہا ہے فلک وقتِ صبح روئے ستم
بنا ہے چشمۂ حسرت ہر ایک دیدۂ نم

نصیب کنجِ مصیبت میں آہ و زاری ہے
ہزار طرح کی آفت ہے بے قراری ہے

خدا کی شان جو رکھتے تھے چوبدار نقیب
بنایا طالعِ بد نے ہے اُن کو ایسا غریب
نہ فرق نوکر و آقا میں اب ہے وائے نصیب
چھپاتے پھرتے ہیں منہ وہ بنے ہیں شکلِ عجیب

پھر آتی کوچۂ رُسوائی میں ہے اب تقدیر
ہر ایک در پہ ہیں دریوزہ گر امیر و کبیر

جو پاؤں خوگرِ گل تھے نثارِ خار ہوئے
جو دل کہ موعدِ راحت تھے بے قرار ہوئے
جو ہاتھ پُر تھے نزاکت سے وہ فگار ہوئے
جو لوگ عیش پہ نازاں تھے اشکبار ہوئے

بنی کچھ ایسی دموں پر کہ آہ بھرتے ہیں
اجل کے نام سے ڈرتے تھے جو وہ مرتے ہیں

دوشالہ پوش تھے جو بے کفن زمیں میں گئے
بجا ہے آنسوں پہ چشمِ فلک بھی گر رو دے
جو قصر رکھتے تھے بے گور خاک میں وہ ملے
یہ وہ ہے غم کہ گریبانِ جامہ ہے ٹکڑے

نشانِ گور میسر نہ خاک پر ہے چراغ
چراغِ گور کے بدلے ہے دل کا روشن داغ

نہ آب و دانہ اسیرانِ غم کو ملتا ہے
بجائے آب ملے اشک رونے کی جا ہے
الٰہی یہ قفسِ چرخ رنج افزا ہے
غذا ہے غم کی شب و روز حال ایسا ہے

نہ شیر خواروں کو ملتا ہے شیر وائے غضب
زبان پھیرتے معصوم ہیں لبوں پر اب

نہ دیکھا تھا جو ستم وہ فلک سے اب دیکھا
پدر کے سامنے بیٹے کو قتل ہائے کیا
یہ وہ ہے حادثہ جس سے جگر بھی ٹکڑے ہوا
غم آئے یاد نہ کیونکر جنابِ اصغر کا

یہ کربلا کا نمونہ دکھاتی ہے دہلی
پدر کو نعشِ پسر پر رُلاتی ہے دہلی

اگر ہو دفترِ محشر تو ہوئے صرفِ بیاں
ہمیں زبانِ قلم کو ہے اتنی تاب کہاں

بنا ہے چشمۂ غم ہائے دیدۂ گریاں
جگر ہے ٹکڑے یہ وہ واقعہ ہوا ہے عیاں

نصیب دہلی کے چمکیں الٰہی ہو آباد
ہر ایک کوچہ ہو رشکِ صبا یۓ بہزاد

ایضاً

دل غنی رکھا سخاوت پہ نہ زر والوں نے
شکرِ نعمت نہ کیا ہم سے بد اقبالوں نے

گھر سے بے گھر جو کیا ہے تو انھیں چالوں نے
پھینکا صحرائے پُر آفت میں انھیں چالوں نے

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

ہائے کیا کیا نہ زمانے کے کیئے مکروہات
ناچ اور رنگ میں دن رات گزاری اوقات

عشق میں محو رہے بھول گئے صوم و صلوٰت
زر کی اُلفت میں ادا ہی نہ کیئے حج و زکوٰت

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

کم ہوئے دام و درم غم کی خریداری ہے
جا بجا دامِ مصیبت کی گرفتاری ہے

ظلم جو جو کرے یہ اُس کی گنہگاری ہے
اب یہ کیوں جوشِ شکایت کی دل آزاری ہے

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

مے کے بدلے ہمیں خونابۂ دل آہ ملا
دل کباب آتشِ عصیاں سے قیامت ہے ہوا

عیشِ مرحوم کا ماتم دلِ گریاں نے کیا
دِن بُرے آئے نتیجہ ہے بُرائی کا بُرا

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

مجمع وعظ سے تھا ہائے گریزاں یہ دل
تھی حسینوں کے فسانے پہ طبیعت مائل
انتقام عمل بد سے رہے ہم غافل
خاک ہے چین فلک سے ہیں بلائیں نازل

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

وائے ناکامیِ قسمت رہی غفلت ہر دم
نیک کاموں سے رہی ہائے یہ نفرت ہر دم
مہ جبینانِ جہاں سے رہی صحبت ہر دم
تھی شبستانِ خرابات سے اُلفت ہر دم

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

بے سبب کاہے کو دینی ہے یہ گردش تقدیر
ہیں سزاوار جفا یاد ہے ہر ایک تقصیر
کیا زباں میں ہو اثر اور دعا میں تاثیر
یعنی ہر جرم گزشتہ کی عیاں ہے تعزیر

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

کنج تنہائی میں کرتے نہیں غمخواریِ غم
چشمۂ اشکِ ندامت ہیں بنے دیدۂ نم
ساغرِ مے کے عوض لب پہ ہے توبہ ہر دم
عیش جتنے تھے کئے اُٹھتے ہوئے رنج و الم

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

عرض یارب یہ مبتلیٰ کی ہے کہ اب بخشش کر
رحم جز تیرے کرے کون گنہگاروں پر

سوئے عصیاں منگر پہ کرم خویش نگر | پڑھ کے اس مطلع پہ درد کو روتے ہیں بشر

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

ایضاً

یہ نئی ہے گردش چرخ کہن | دشمن جاں ہے جفائے دل شکن
وہ بلا آئی گئی ہے دل پہ بن | اب نہیں ہے ہائے جائے دم زدن

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

پہلے محشر سے قیامت آگئی | حشر کی سر پر مصیبت آگئی
لب پہ گردوں کی شکایت آگئی | جان پُر افسوں پر آفت آگئی

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

لٹ گیا اسباب چھوڑا سب نے گھر | اب ہے صحرائے مصیبت کا سفر
حال بد پر اپنے ہر دم ہے نظر | اس مصیبت کی نہ تھی اصلا خبر

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

مفلسی کی ہر طرف اب ہے پکار | مال کو روتے ہیں اپنے مالدار
غم ہے کھانے کے لیے لیل و نہار | آب کی جا اشک دے ہے چشم زار

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

پاؤں میں جوتے نہ سر پہ ہے کلاہ
ہے فلک کے ظلم پر سب کی نگاہ
تن ہے عریاں ساری خلقت ہے تباہ
خستہ دل اللہ سے ہیں داد خواہ

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

ہے قیامت کا نمونہ دیکھ لو
بھائی کی بھائی کو کب ہے جستجو
کچھ نہ بیٹے کی خبر ہے باپ کو
باغِ عالم میں نہیں الفت کی بو

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

فرشِ گل کی جا ہے بستر خار کا
صدمہ ہے اندوہ کے آزار کا
رنگ فق ہے ہر جگر افگار کا
دل فسردہ حال ہے بیمار کا

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

خوابہائے عیش کو کیا ہو گیا
کیا کیا تو نے یہ چرخ پُر جفا
یہ ہی افسانہ ہے کیا تھا کیا ہوا
یہ ستم تھا اے ستمگر کب روا

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

آہ بر لب چشم پُر نم زرد رو
ہے پریشانی قیامت مو بمو

ہائے ہائے کی صدا ہی چار سو	خاک میں سب کی ملی ہی آبرو

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

شہر تھا یہ ثانیِ خلدِ بریں	اس چمن کے گل ہوئے صحرا نشیں
ہوگئی ویران دہلی کی زمیں	اس ستم پہ دل ہی روتا ہی میں

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

ایضاً

ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن انھیں روتا ابرِ بہار ہی
کہ فرشتے پڑھتے ہیں فاتحہ نہ نشان ہی نہ مزار ہی
نہ تھا شہر خلد سے بھی یہ کم سبھی جا خوشی تھی نہ تھا الم
چلی ایسی بادِ سموم و غم نہ وہ رنگ ہی نہ بہار ہی
کہو کیونکہ اپنی ہو زندگی کوئی جائے امن نہیں رہی
کہیں تیغ تیز کھنچی ہوئی کہیں پھانسی ہی کہیں دار ہی
پھرے دشت بدشت تباہ سب برے دن دکھائے فلک نے اب
نہیں تھمتے اشک ہیں روز و شب یہی شغل ہی یہی کار ہی
نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ انجمن جسے دیکھو غم میں ہی نعرہ زن
نہ وہ سیرِ باغ نہ وہ چمن جہاں گل تھے کثرتِ خار ہی

جو دوشالہ پوش تھے مثلِ گل جو لبوں پہ رکھتے تھے جامِ گل
بنے دشتِ غم کے ہیں خارِ گل نہ قبا ہے تن پہ نہ تار ہے

ہوئی تنگ امتِ مصطفیٰ نہیں اٹھتا صدمہ عذاب کا
کہیں رحم جلد ہو یا خدا بُرے وقت کا تو ہی یار ہے

کہی وہ غزل ہے یہ اے مبیں جسے سن کے روتے ہیں مہ جبیں
وہ ہے کون جس کو کہ غم نہیں یہاں سب کا سینہ فگار ہے

مجروح میر مہدی مرحوم دہلوی

مرزا غالب کے شاگرد رشید تھے سنہ ۱۳۲۰ھ مطابق سنہ ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا ان کے والد کا نام میر حسین فگار تھا اپنے والد کے تخلص کی رعایت کو ملحوظ رکھ کر اپنا تخلص مجروح رکھا تھا۔

یہ کہاں جلوۂ جاں بخش بتانِ دہلی
کیونکہ جنت پہ کیا جائے گمانِ دہلی

ان کا سبب وجہ نہیں لوٹ کے ہونا برباد
ڈھونڈھتے ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی

جس کے جھونکوں سے ہوا طبلۂ عطار ہنی
ہے وہ بادِ سحر عطر فشانِ دہلی

سمجھے ہیں سوئے ادب جنتِ ثانی کہنا
وہ کچھ اشخاص جو ہیں مرثیہ خوانِ دہلی

یہ ستم دیکھ چکے تھے کہ رہے آسودہ
فتنۂ حشر میں آفت زدگانِ دہلی

اس لیے خلد میں جانے کا ہر اک طالب ہے
کہ کچھ اک دور سے پڑتا ہے گمانِ دہلی

ضربتِ رشتۂ بیداد و ستم سے مجروح
صرفِ بیداد ہوئے منتخبانِ دہلی

محسن حکیم محمد محسن خاں مرحوم دہلوی

دیارِ ہند میں یہ تخت گاہ تھی دہلی
تمام شہروں کی پشت و پناہ تھی دہلی
ثریا جاہ فلک بارگاہ تھی دہلی
گناہگار ہوئی بے گناہ تھی دہلی
یہ انقلابِ زمانہ سے ہو گئی برباد
اُکھڑ کے پھک گئی اب اس کی بیخ اور بنیاد

یہ شہر وہ ہے کہ تھا افتخارِ ہفت اقلیم
شکوہ و رفعت و شوکت میں رشکِ عرشِ عظیم
محلِ پایۂ اورنگِ خسروانِ قدیم
فضا و حسن میں غیرتِ فزائے باغِ نعیم
خدا ہی جانے کہ اس پر لگی ہے کس کی نظر
ہر ایک قصبہ و قریہ سے ہو گیا کمتر

اسی کو کہتے تھے سب رشکِ خطۂ کشمیر
نہ تھا جہان میں اس کا کوئی عدیل و نظیر
اسی کو کہتا تھا عالم مرقعِ تصویر
مہوسوں کے لیے جس کی خاک تھی اکسیر
کوئی تو ایسا ہی سرزد ہوا ہے اس سے قصور
مثالِ بختِ سیہ ہو گیا جو یہ بے نور

اسی سے ہو گئی اقلیمِ ہند کو زینت
اسی کو دیتے تھے سب باغِ خلد سے نسبت
اسی سے پائی ہر ایک اہلِ ہند نے عزت
اسی کی ہو رہی سارے جہان میں شہرت
جہاں میں ہو گیا یہ شہر اس قدر بدنام
یہاں سے چھوڑ کے جاتے ہیں لوگ اپنے مقام

وہ لعل قلعہ جسے کوہِ طور کہتے تھے
فضا کو جس کی فضائے قصور کہتے تھے

وہ نازنین جنھیں رشکِ حور کہتے تھے
وہ شاہزادے جنھیں سب حضور کہتے تھے

رہا نہ کوئی حسین اور نہ کوئی وارثِ تخت
مٹانے تخت کو آیا تھا بخت خاں کم بخت

وہ لال پردہ کہ بس پردہ پوشِ عالم تھا
وہ گویا پردہ پرنورِ چشمِ آدم تھا
وہ مجرا گاہِ سلاطین و حاتم و جم تھا
وہ سجدہ گاہِ نریماں و زال و رستم تھا

تمام کھودتے پھرتے ہیں اس جگہ مزدور
ظہور اُس کا ہوا جو خدا کو تھا منظور

وہ تو محلہ کہ تھا رشکِ کوچہ و بازار
طواف کرتی تھی ہر صبح جس کا بادِ بہار
ہر ایک مکاں تھا مصفا بصورتِ گلزار
بنا تھا کوچہ ہر اک اُس کا مصر کا بازار

اب اُس محلہ کا باقی رہا نہ نام و نشاں
نظر وہ قلعہ میں آتا ہے مثلِ گورستاں

وہ جنگلی ڈیوڑھی جو تھی رشکِ وادیِ ایمن
کہ شمعِ طور تھی ہر ایک واں کی شمع لگن
مہک رہی تھی وہ پھولوں سے صورتِ گلشن
سجی ہوئی تھی حسینوں سے مثلِ صحنِ چمن

وہ دشتِ قیس کے مانند ہو گئی ویران
جرس کی آتی ہے آواز اس جگہ ہر آن

ہوئی وہ ڈیوڑھی کی بنیاد اس طرح برباد
کہ گویا پھینک دی اُس کی اکھیڑ کر بنیاد
نشان بھی نہ رہا اُس کا اب کسی کو یاد
ہر ایک دیکھ کے بس اُس کو کرتا ہے فریاد

الٰہی کیا ہوئے اب یاں کے وہ مکان مکیں
فلک اُٹھا کے کہاں لے گیا ہے یاں کی زمیں

وہ لال جوڑے پہن کر کوئی نکلتی تھی
وہ بانکپن سے اُٹھا پائنچوں کو چلتی تھی
وہ ہاتھ پاؤں میں مہندی کو اپنے ملتی تھی
وہ بات بات میں انداز سے مچلتی تھی
ہوئے ہیں رنج و تردد میں اب تو وہ محبوس
بجائے مہندی کے ملتے ہیں وہ کفِ افسوس

دکھاتے اُن کو تبسم سے وہ لبِ اعجاز
سُناتے اُن کو وہ شوخی سے ناز کی آواز
مچل مچل کے دکھانا وہ اُن کا عشوۂ ناز
نئی ادا سے دکھانا وہ چال کا انداز
یہ اُن کا ہو گیا ہے اب تباہی سے احوال
کہ ساری بھول گئے اپنی وہ ادا کی چال

کسی کے جسدِ معنبر میں نقرئی موباف
کسی کا چہرۂ پُر نور مثلِ آئینہ صاف
کروں میں محرم و کرتی کے اُن کی کیا اوصاف
قلم کی طرح سے ہوتا ہے غم سے سینہ شگاف
نصیب اُن کو شب و روز اب ہے سینہ زنی
ملے ہے کھانے کو ہیرے کی بھی نہ اُن کو کنی

وہ لوگ بسترِ سنجاب پر جو سوتے تھے
سحر گلاب سے جو منھ کو اپنے دھوتے تھے
تمام عمر کو لہو و لعب میں کھوتے تھے
وہ بال بال میں موتی سدا پروتے تھے
اب اُن کا حال تباہی سے ایسا ابتر ہے
بچھونا خاک ہے اور خشت بالشِ سر ہے

جو گنتھے پھولوں کے پھرتے تھے پہنے گردن میں
اکڑتے پھرتے تھے مانندِ سرو گلشن میں
سراپا محوِ تماشا تھے اپنے جوبن میں
خوشی سے پھولے سماتے نہ جامۂ تن میں
ہوئے وہ اندنوں نانِ شبینہ کو محتاج

اگرچہ شیر سے تھے پر ہو گئے وہ روبہ مزاج

سحر نے اپنا گریباں کیا ہے غم سے چاک
رہے ہے نرگسِ بیمار بھی سدا غمناک
اُڑاتی پھرتی ہے سر پر صبا چمن میں خاک
پہن کے بیٹھی ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک

بہارِ گلشنِ دہلی پہ آگئی ہے خزاں
رہا نہ صفحۂ ہستی پہ ان کا نام و نشاں

ہر اک مکاں تھا یہاں رشکِ روضۂ رضواں
ہر اک کوچہ میں موجود عیش کا ساماں
ہر اک جواں تھا یہاں رشکِ حور اور غلماں
ہر اک مکاں میں رہتی تھی محفلِ خوباں

بجائے بلبل و طاؤس بولتے ہیں کلاغ
ہر اک مکاں میں ہے موجود آشیانۂ زاغ

ہر ایک کمرہ تھا روشن بسانِ برجِ حمل
یہ ہوتی ہے در و دیوار ان کے پر صیقل
مثالِ کاخِ مصور سجا ہوا مبتل
نظر وہ آتی تھی جو چیز بھی اُدھر اوجھل

نہ وہ حسین رہے اور نہ وہ مکان و مکیں
سڑک کے واسطے دلّی میں رہ گئی ہے زمیں

ہر اک حکیم یہاں تھا ارسطوئے ثانی
ہر اک حسین یہاں رشکِ ماہِ کنعانی
ہر اک امیر کو تھا دعویٔ سلیمانی
ہر اک فقیر کو حاصل تھا علمِ عرفانی

بسانِ نقشِ قدم ہو گیا ہر اک پامال
دیارِ ہند سے سب اُٹھ گئے ہیں اہلِ کمال

وہ ہائے رہتی تھیں دہلی میں نازنیاں جو حسیں
خجل تھا عارضِ روشن سے جن کے ماہِ مبیں
کوئی تھی حور شمائل کوئی تھی زہرہ جبیں
سرود و رقص سے پامال اُن کے اہلِ زمیں

یہ انقلابِ فلک سے وہ ہو گئیں ناچار
جہاں میں پھرتی ہیں آوارہ مثلِ گرد و غبار

بنے ہوئے تھے وہ چوپڑ کے چوک میں بازار
ہر ایک دیدۂ آئینہ روشن و ہموار
کہ جیسے چار چمن ہوں بسطحِ گلزار
خجل تھا جس سے خطِ عارضانِ گل رخسار

ہر اک دکان میں بیٹھا ہوا ہے فریادی
ٹپک رہی در و دیوار سے ہے بربادی

اور اس میں حوض تھا اک مثلِ چشمۂ کوثر
ضیا میں چشمۂ خورشید سے بھی روشن تر
بجائے آب وہ لبریز نور سے یکسر
صفا میں چادرِ مہتاب کا تھا وہ ہمسر

سراپا بھر دیا ہے اس میں خس و خاشاک
اٹا ہوا وہ پڑا ہے بمثلِ تودۂ خاک

یہ نہر دونوں طرف خوشنما تھی اس کی رواں
صفائے آب سے شرمندہ اس کے تھا فیاں
زمیں میں چھپ گیا خجلت سے چشمۂ حیواں
لبوں کو چاٹتے تھے پانی پی کے حور وشاں

ہوئی ہے فرطِ کدورت سے اب وہ خاک آلود
تمام خاک میں بس مل گئی ہے اس کی نمود

وہ موجیں اس کی لطافت میں مثلِ کاکلِ حور
چراغ اس کے فروزاں وہ مثلِ شعلۂ طور
حباب اس کے نمایاں بشکلِ قبۂ نور
بوقتِ سیر وہ تھی خاص و عام کی منظور

یہ کاوکاوِ زمانہ سے ہو گئی ہے خراب
کہ جیسے ماہی تڑپتی ہے خاک پر بے آب

بہ گرد و پیش گملوں اس کے کثرتِ اشجار
شگفتہ چار طرف گویا تختۂ گلزار

نثار ہوتی تھی ہر صبح اُس پہ بادِ بہار — ہجومِ خلق سے رونق فزا وہ لیل و نہار

خزاں رسیدہ نظر آتا تھا ہر ایک شجر
ہر ایک برگ بنا اُس کا صورتِ محشر

سُناتے پھرتے تھے سقے کٹوروں کی جھنکار — وہ گل فروشوں کے پھولوں کے ٹوکروں کی بہار
وہ سودا بیچتے تھے لوگ اِں پکار پکار — وہ پھرنا خوانچہ والوں کا وہاں قطار قطار

رکھا تھا دہلی کا لوگوں نے نام عشق آباد
بسانِ خانۂ عاشق وہ ہو گئی برباد

جو نافِ شہر میں واقع تھی مسجدِ جامع — وہ حسن و وسعت و رفعت میں گویا تھی جامع
بسانِ برجِ حمل اُس کے بیچ تھے لامع — موذنوں کے فرشتے وہاں کے تھے سامع

کیوں کہ ہووے جہاں میں وہ واجب التعظیم
بنی ہوئی ہو سراسر وہ شکلِ عرشِ عظیم

تھے اُس کے چار سو چوپڑ کے خوشنما بازار — خجل تھا جن سے خطِ عارضانِ گل رخسار
برنگِ بزم وہ آراستہ تھے لیل و نہار — سہ پہر کو تھی وہ گدڑی کی سیڑھیوں پہ بہار

فلک نے کر دیا ہر سمت اُس کے ویرانہ
بنا ہے ایک طرف اُس کے اب شفا خانہ

نمازی دیکھ کے ہر صبح اُس کو روتے ہیں — مدام چہروں کو اشکوں سے اپنے دھوتے ہیں
اسی کے رنج و تاسف میں جان کھوتے ہیں — نہ دن کو کھاتے ہیں نہ رات کو وہ سوتے ہیں

وہابی ہو گئے ہیں سارے اندروں باہم
کسی کو رکھنے نہیں دیتے اُس جگہ پہ قدم

یہ شہر وہ ہے کہ تھے اس میں خلد کے ساماں — ہر ایک شخص یہاں تھا بجائے خود رضواں
ہر ایک طفل یہاں کا تھا ثانیِ غلماں — دبیرِ چرخ کا ہمسر تھا یاں ہر ایک جواں

رہا نہ کوئی جواں اور نہ کوئی پیرِ امیر
برائے مخبری کے رہ گئے ہیں چند شریر

اکڑ کے پھرنا جوانوں کا وہ سرِ بازار — پہن کے ٹوپیاں زریں وہ باندھ کر دستار
کسی کے ہاتھ میں باڑھی کوئی لیے تلوار — کوئی تھا گھوڑا کداتا کوئی تھا فیل سوار

نہ وہ جوان رہے اور نہ کوئی ہے خوشحال
رہے ہیں وہ ہیں اب کھانے والے ماش کی دال

مدام جنتی لوگوں کو رہتی ہے عسرت — کہ اُن کے واسطے حق نے بنائی ہے جنت
عبث ہے منعموں کو نازِ سطوت و شوکت — مثال سانپ کے لپٹے گی اُن کو یہ دولت

جو اہلِ دین ہیں اُن کے لیے ہے باغِ نعیم
جو مشرکین ہیں اُن کو ملے گی نارِ جحیم

میں دردِ دل کہوں اب کس سے جا کے اے محسن — نہ کوئی یار رہا ہے نہ کوئی اہلِ وطن
شبانہ روز ہوں میں مبتلائے رنج و محن — مٹا ہے سامنے آنکھوں کے میری یہ گلشن

خدا کرے کہ یہ ہو جائے پھر چمن آباد
مثالِ گل کے ہوں باشندے یاں کے خرم و شاد

ایضاً

وہ پری چہرہ ہوئے قتل میانِ دہلی — موت بھی جن کی ہوئی آفتِ جانِ دہلی
ایسی آباد تھی کیا کیجے بیانِ دہلی — ہو گی جنت بھی نہ آباد بسانِ دہلی

بے نشاں ہو گیا عالم میں نشانِ دہلی / لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی

ملتا دیکھا جو بہت نقشہ یہاں کا ہم نے / ہو گیا روضۂ رضواں پہ گمانِ دہلی

نام خورشید ہے محشر میں دکھانے کو فلک / رکھتا ہے سینہ پہ یہ داغِ زبانِ دہلی

کیا کہیں ملکِ عدم میں بسیں گے جا کر / ہوئے جاتے ہیں جو معدوم مکانِ دہلی

پیرہن شکل زلیخا مہِ کنعاں ہیں جواں / خالی از حسن نہیں پیر و جوانِ دہلی

ابر سمجھو نہ اسے چھا گیا ہے گردوں پر / دودِ آہِ جگرِ سوختگانِ دہلی

غم و غصہ تو سدا کھاتے ہیں عشرت کے سبب / پیتے ہیں خونِ جگر بادہ کشانِ دہلی

ہو گئیں بے خواب جو چشمانِ ملایک شاید / تا فلک پہونچ گیا شور و فغانِ دہلی

لوگ جب دہلی کو دیں خلد بریں سے نسبت / کہیں ہر پیر کو ہم کیوں نہ جوانِ دہلی

ہے کہاں کوچہ و بازار و محلہ باقی / خط پہ کیا خاک لکھوں نام و نشانِ دہلی

ادب آموزِ ملایک ہیں یہاں کے جاہل / رشکِ حورانِ بہشتی ہیں بتانِ دہلی

چشمۂ آبِ بقا نام تھا جس کا اب وہ / اشکِ حسرت سے بھری نہرِ روانِ دہلی

گھر لٹا مال لٹا جان گئی اب تک بھی / ہیں مصیبت میں مصیبت زدگانِ دہلی

وا رہیں آنکھیں پس از قتل بھی مقتولوں کی / تن بیجاں ہیں مگر ہیں نگرانِ دہلی

اب جو دلی ہوئی آباد تو کیا خاک ہوئی / جن سے زینت تھی کہاں ہیں وہ جوانِ دہلی

ایسے سرسبز تھے عالم میں فرشتے آ کر / لاکے دکھلاتے تھے رضواں کو مکانِ دہلی

کیوں نہ مطبوعِ جہاں یاں کی زباں ہو محسن
سب زبانوں کی خلاصہ ہے زبانِ دہلی

مہدی۔ سید مہدی حسین مرحوم دہلوی

رات دن لب پہ نہ ہو کیونکہ بیانِ دہلی
نہ مکیں اب وہ رہے اور نہ مکانِ دہلی

بعض مقتول ہوئے بعضوں نے پھانسی پائی
نام کو بھی نہ رہے پیر و جوانِ دہلی

شکوہ بے فائدہ کرتا ہے کسی کا ہمدم
تھا مقدر میں لکھا یونہیں زیانِ دہلی

نہیں بازارِ محبت میں خریدارئ دل
چھان ڈالی ہے ہر ایک میں نے دکانِ دہلی

نہ وہ اربابِ طرب ہیں نہ وہ ہیں اہلِ نشاط
ہاں نظر آتے ہیں کچھ مرثیہ خوانِ دہلی

غمزہ تھا آفتِ جاں اور قیامت قامت
عجب انداز کے تھے ماہ رخانِ دہلی

گھسکے صندل کا لگانا جنھیں تھا دردِ سر
دل پہ رکھتے ہیں وہ اندوہِ گرانِ دہلی

فرشِ گل پر جو جھجکتے تھے قدم رکھتے ہوئے
چلتے کانٹوں پہ ہیں وہ نازکنانِ دہلی

عرش پہ غش آتے اگر دیکھتے حضرت یوسف
ایسے انداز کے تھے کج کلہانِ دہلی

جھک گیا چرخ خجل ہو کے قدمبوسی کو
اس نے دیکھی تھی کبھی رفعتِ شانِ دہلی

ہوش جاتے رہے تھرا گئی نارِ دوزخ
پہونچی افلاک پہ جب آہ و فغانِ دہلی

خاک جل بھن کے تو ہو جائے گا چرخِ بدکیش
نالہ کرنے بیٹھے جو دلسوختگانِ دہلی

کچھ عجب نقشہ یہاں کا نظر آتا ہے مجھے
کیونکہ دلی پہ کیا جائے گمانِ دہلی

اور شہروں کو کریں لاکھ تکلف لیکن
نہیں ہونے کی میسر یہ زبانِ دہلی

ہیں نئے رنگ نئے روپ جہاں کے مہدی
کفِ افسوس ہیں اور لالہ رخانِ دہلی

ہنرؔ میرزا الٰہی مرحوم۔ دہلوی

تھے ہنرؔ ہم سببِ عظمت و شانِ دہلی
نہ رہے ہم نہ رہا نام و نشانِ دہلی

اس کو لازم ہی بیابانِ عدم سے تشبیہ
نہیں اس شہر پہ اب ہم کو گمانِ دہلی

واہ کیا گرمیِ گفتار ہی سبحان اللہ
شعلہ و برق و شرارہ ہی زبانِ دہلی

خلد سے آتے ملائک تھے خریداری کو
ایسی آباد تھی ہر ایک دکانِ دہلی

رفعتِ عرشِ معلیٰ سے بھی سبقت لے جائے
لکھنے بیٹھوں میں اگر رفعت و شانِ دہلی

آہ ای پیرِ فلک دیکھ تری گردش سے
کس طرح قتل ہوئے پیر و جوانِ دہلی

نام مٹنے کا نہیں حشر تلک ہووے گا
گو فلک تو نے مٹایا ہی نشانِ دہلی

ساکنِ باغِ جناں رہتے تھے مشتاق اس کے
قصرِ جنت سے بھی بہتر تھے مکانِ دہلی

عدم آباد ہی برباد ہوئے سے یہ دیار
اب وہ مُردے ہیں جو بستے تھے میانِ دہلی

حوریں جنت کی جنھیں دیکھ کے پڑھتی تھیں درود
وہ حسیں حق نے بنائے تھے میانِ دہلی

ٹوٹ جاتا ہی دل انسان کا دہلی کی طرح
جب ہنرؔ ہم کبھی کرتے ہیں بیانِ دہلی

سوداؔ۔ ملک الشعرا مرزا محمد رفیع مرحوم دہلوی

مرزا محمد شفیع دہلوی کے صاحبزادے اور شاہ حاتمؔ کے شاگرد تھے ۱۱۲۵ھ ۱۷۱۳ء میں ولادت ہوئی۔ شاہ عالم کی بارگاہ سے ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ لکھنؤ پہونچکر نواب آصف الدولہ کے دربار سے چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ جو ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء میں ہوا اس سے قبل کی بدنظمی

اور بعد کے انقلاب سے متاثر ہو کر سودا نے جو نظم لکھی تھی وہ اس مجموعہ میں انقلابات دہلی سے متعلق ہونے کی بنا پر شامل کر دی ہے۔ سودا مرحوم کا انتقال بعمر ستر سال ۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۱ء لکھنؤ میں ہوا وہیں دفن ہوئے۔ مطبوعہ کلیات ان سے یادگار رہے۔ ان کا مشہور شہر آشوب یہ ہے۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواڈول
لگا وہ کہنے کہ اس کے جواب میں وہ بول
پھرے ہے جا بجا ہیں نوکر ہو لیکے گھوڑا مول
اگر کہوں میں تو سمجھے گا تو کہ یہ ہے ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیر یوں یا تول

سپاہی رکھتے ہیں نوکر امیر دولت مند
کیا ہے ملک کو غارت سے سرکشوں نے پسند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
جو ایک شخص تھا بائیس صوبہ کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوجداری کول

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
جو عامل اب ہیں محالات کے سو ہیں یہ خفیف
ٹکے کہاں جو ہمیں دیکے ہوں اُنھوں سے حریف
نکچھ ربیع میں حاصل نکچھ میان خریف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اَول

بس ان کا ملک میں کارنس جو یوں ہو تباہ
جگہ وہ کونسی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ
کہ کو وزر ہو زراعت میں لے ندیں پر کاہ
کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

ہے ہی فقط عربی باجہ پہ اُنھوں کی شان
پر اُن کو فکر ہے تخفیف خرچ کا ہر آن
جو چاہیں اس کو نہ بجوائیں وہ تو کیا امکان
رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
گلے ہیں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول

نہیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور
کہ ہوں دو مور چھل اور ایک کا ہنے طنبور

ملہ ضمانت میں دیا ہوا آدمی

نہ رسمِ صلح کی سمجھیں نہ جنگ کے دستور ۔۔۔ جو اُن میں قاعدہ داں تھے ہوئے وہ ایسے دور
تماشا ان کی طبیعت کا ہر طرح سے ٹٹول

امیر اب جو ہیں دانا انھوں کی ہے یہ چال ۔۔۔ ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانہ کا حال
بچھی ہے سوزنی تو جا کے گھر اجلے ہے رومال ۔۔۔ حضور بیٹھے ہیں دو اک ندیم اہلِ کمال
دھری ہے رو برو ایک پیکدان اک تنبول

جو کوئی ملنے کو اُن کے انھوں کے گھر آیا ۔۔۔ ملے یہ اُس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکرِ سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا ۔۔۔ انھوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لیے جمع ہوں صغیر و کبیر ۔۔۔ تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پہونچنے کی سوجھی ہے بخشی کو تدبیر ۔۔۔ کھڑا یہ اٹکلے دیوانِ خاص بیچ وزیر
کہ شامیانوں کے بانسوں پہ نقرئی ہیں خول

خجل ہو یہ نہ سمائے زمیں بہت بھائی ۔۔۔ گئے وہ مشورہ میں کھلیں جو سوا[1] پائی
تمام عمر ہی تدبیر ملک میں کاٹی ۔۔۔ نِدان کر اُٹھے مل کر گھر اینٹ کا ماٹی
پھر اپنے زعم میں ہر اک برائے خود بہلول

پڑے جو کام اُنھیں تب نکلے کھائی سے ۔۔۔ رکھیں وہ فوج جو موٹی پھرے لڑائی سے
پیادے وہ جو ڈریں سر منڈاتے نائی سے ۔۔۔ سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا انھوں کے نیچے الول[2]

نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری ۔۔۔ سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتریوں کی ہیں کیا کہوں خواری ۔۔۔ سوالِ دستخطی کو پھاڑ کرکے پنساری

[1] اندازہ کرے [2] اکیل - [3] چھپنا کودنا۔

کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار — تلاش کر کے ڈھیٹی انھوں نے کی ناچار
نذان بنیوں کے دی قرض میں سپر تلوار — گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار

بغل کے بیچ تو سوٹا ہے ہاتھ میں پچکول

کروں معاش کا حضرت کی تجھ سے کیا میں بیان — کہ توشہ خانہ ہے ان کا پرائیچہ کی دکان
نکل تنور کے منہ سے کہے ہے گا وہ زبان — پکی ہوں تب میں کہ جب تھا تجھی خلد مکان

سبکے ہے تیسرے فاقہ میں کوڑیوں کے مول

کہو جو مودی سے جا کہہ دو آپکے حالات — جواب دے وہ کہ ہیں دو سنٹ تو فرشتہ کی ذات
ہوا ہے جیسی ہے پیلوں کی اور بس پہ برات — جو مجھ پہ ہیں انھوں نے پیا ہے آب حیات

تمھارے کھانے کو دانہ کہو تو دیجے تول

جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں تو کیا امکان — کہ ہووے گھانس کے پتے کا ان کے آگے نشان
کسی کی ٹوٹی ہے ٹنگڑی کسو کا جھڑ گیا کان — طویلہ اس کو کہو یا کہ پنج پیر کا تھان

اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانواں ڈول

اور اب جو زعم میں آقا کے فیل خانہ ہے — جو ہتنی اندھی ہے اس میں تو ہاتھی کانا ہے
نہ ٹھور جانے کا داتب کا نے ٹھکانا ہے — ہر ایک بھوک سے سمجھے ہے عدم روانہ ہے

اب اس کو خواہ وہ پائل سمجھ لیں خواہ جھول

کریں ہیں بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش — کہیں پلاؤ تو باورچی واں پکا دیں آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش — تلے سے ان کے مسند کو کھینچ لیں فراش

اگر کہیں کہ منا اٹھ کے چاندنی کا جھول

۱؎ ہتھیار بند محافظ کا عہدہ ۲؎ پرانے کپڑے بیچنے والا ۳؎ پٹنا پور کا مشہور شاعر اور خوشنویس

یہ خادمانِ محل کی ہے اندنوں صورت — نہ خوانِ ڈھونے کا کشمیرلی میں باقی ست
نہ اُٹھ کے ملنے کی ہرگز نہ رہنے کی طاقت — بنی ہے بھوک سے درباریوں کے منہ کی گت
کہ بوڑھی ہتنی کے جس طرح بیٹھ جائیں کپول

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ — کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آنسے دے مارتا ہے کواڑ — کوئی کہے جو ہم ایسے ہی چھاتی کے ہیں پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجے گھول

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا — کہ بے زری نے گھرا ایسا جب آ نکر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا — نہیں ہے فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

جو نوکری ہے کہیں زیرِ چرخِ نیلی فام — سو جانا دکا اُس کی ہے پڑ گیا نیلام
وبا کا جیسے ہے دار الخلافہ میں ہنگام — گھروں کی ضبطی کا حکم اس قدر ہوا ہے عام
ادھر کسی کا دکھا سر اُدھر سے دوڑی قول

سو کیا وہ نوکری کٹتی ہو جس میں اوقات — ملے ہے پیٹ کو روٹی سو روز رو ادھی لات
جو چاہیں تن ڈھکے اس میں سو آگے پیچھے پات — اور اُس پہ یہ ہے کہ ہر روز کھڑے موجودات
جو پانچوں باندھیے ہتھیار اور چھٹی پستول

وہ نوکر اب جسے آقا ہر آن بہکائے — کہے ہے آہ وہ بھر کر سوائے آٹھ آنے
جو پوچھو اُس سے کہ تم کچھ روپے لگے پانے — روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
کہ اس زمانہ میں چپٹا بنے ہے وہ یا گول

غرضکہ جب کہیں ملتا ہو پاؤ بھر بھی چون — کرے وہ نوکری جس کو کہ ہووے خبط و جنون

لہ سپاہیوں کی بھیڑ

یہ سمجھو کہ نہیں جب سپہ گری کے فنون — نئے تو سیکھ کے یوں باندھنے لگے مضمون
زمانہ دیکھ کے ہتھیار ہم نے ڈالے کھول

سخن جو شہر کے دیدلے سے کروں آغاز — تو اس کو سن کے کریں ہوش چند کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ وہ جس میں شغال کی آواز — کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

کسی کے یاں نہ رہا آسیا سے تا بہ اجاغ — ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ — اور اُن مکانوں میں ہر سمت ہینگتے ہیں الاغ
جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر ہنڈول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس — کہ جن کے دیکھے سے جاتی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس — بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم — نہ جانے کس نے رکھا یہاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اُگے ہیں زقوم — مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

رکھیں تھے سیر پنگھٹ کے گرد کے دیہات — کہ لب جہاں کی تھے پنہاریوں کے آبِ حیات
اور اُن درختوں کی وہ چھائیں اور گھنے سے پات — نہ وہ درخت ہیں اب نے ان نہ آدمی کی ذات
کوئیں میں مردے پڑے ہیں نہ رسیاں ہیں نہ ڈول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا — مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اُٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا — عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی واں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس
پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے فانوس
کروڑوں بر نہ اُمید ہو گئے مایوس
گھروں سے یوں نجبا کے نکل گئے ناموس
ملی نہ ڈولی انھیں جو تھے صاحبِ چنڈول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہاتھ ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور اُن کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

اگر محب ہوا وہ مستمع تو سن یہ نام
دیا کچھ اس نے بمقدور کر کے نذرِ امام
پڑا جو شامتِ طالع سے خارجی سے کام
دروغ در است کا لایا وہ درمیان کلام
پہ آئے اور چلیں کہہ کے زیرِ لب لاحول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھے کہ یہ قہر
کروڑ مرتبہ خاطر میں گذرے ہے یہ لہر
چٹانک بھی اس دل اپنے کو ہوئے گر زہر
تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردمِ شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں
وہ دل نہیں ہے کہ اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پر آب نہیں
سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ہے اک طرح کا زیادہ نہ بول

ایضاً

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ رے کیا نظمِ بیاں ہے

اتنا میں کیا عرض کہ فرمایئے حضرت | آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے
سنکر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا | اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ میں کئی شکل | ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے
گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی | تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر | شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیئے کے ہاں ہے
ثابت ہے جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال | تیروں میں ہے پرگیری تو بے چلہ کماں ہے
کہتا ہے نفر غرّہ کو صراف سے جا کر | بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے
پشمن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ | شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے | تنخواہ کا پھر بیٹنا اس شکل سے یاں ہے
لیتے ہیں بایں روپیہ وہ تو دو ماہہ | ٹک دھونس دھڑکے کی جھنجھٹ سے تواں ہے
قاضی کی جو سج ہے گدھا باندھے اس میں | بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے
ملا جو اذاں دیوے تو منہ موند کے ہنکا | کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے
بولا جو خطیب اس میں تو ماری اسے اک ڈھول | ہاتھ آگیا واعظ تو ٹھپیڑا او وہاں ہے
رینکے ہے گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے | نے ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے
اور وہ ہیں جو کمزور وہاں آن کے بیٹھیں | رہتی کے جو آگے کی وہ ہر ایک دکاں ہے
اٹھ اٹھ کے دکھاتے ہیں کھڑی حال وہ اپنا | دربار رو[1] اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے
یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پالکی آگے | اس وجہ سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی سر پہ کیئے خاک کوئی چاک گریباں | کوئی روئے ہے منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ہندو و مسلماں کو پھر اس پالکی او پہ | ارتھی کا تو ہم ہے جنازے کا گماں ہے

[1] دربار میں جانے والا۔

پسنحرہ کی دیکھ کے جا صاحب[1] ارتھی
کرتے ہیں جو واں عرض[2] تو لے نا وہ نہ ہاں ہے

گر ہوجیے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب
اس کی تو اذیت بھی ہی آفت جاں ہے

وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں وزانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے

بے وقت خورش اس کے جو ہو اپنے تئیں بھوک
سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے

گھڑیال کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں
اور پیچ خلا و دن میں جو لا سپہ واں ہے

خمیازہ پہ خمیازہ ہے اور حرکت[3] او پہ حرکت
سو یہ صورت سوفار پر تشکل کماں ہے

صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپیہ کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے

صحبت ہی یہ اس سے اگر آقا کے سیس چھینک
آوے۔ تو وہ اس کو بجنشونت نگراں ہے

دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے

اور ما حضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں پہ اس کو خفقاں ہے

مطبوخ میں ہی خرپزہ اور خربزہ پر دودھ
ہے دودھ پہ مچھلی نس اوپر گاؤزباں ہے

یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلی
اس سب پہ تفنن کے لیے بیسنی نان ہے

اس میں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں اس کے
پھر بوعلی سینا ہے تو وہ ہیچمداں ہے

رکھتے ہیں غرض مرگ سے لڑنے کو سپاہی
گر نوکری کیجو یہ طبابت کی کہاں ہے

سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے

ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل
ہر شام یہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے

لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنیئے تو عجب طرفہ بیاں ہے

قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ یہ دزدی کا گماں ہے

جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق
پھر بیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے

[1] پالکی سوار [2] دربار میں [3] انگڑائی

پروانہ لکھا کر گئے عامل کئے جس وقت
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس بھی لیجا
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے
دو بیل کی جا کر جو کہیں کیجیے کھینی
ہیں خشکی و غرقی کے تفکر میں شب و روز
گر نالان و خواتین کی لے کوئی وکالت
ہر عمدہ کے دروازہ پہ زین پوش پہ بیٹھا
ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں فوارہ سا چھوٹوں
دیوان کے بخشی کے بیوتات کے حاضر
ہر بات پلٹتا ہی ہے صبح سے تا شام
لاوے جو کچہری سے وہ وا موں کا سیاہا
سوما ہی پہ بیٹھی ہو ولے پانسو ہو خرچ
بتا دے غرض پیسے اڑا کر ہوا روپوش
جس وقت سنا یہ وہیں آواز بدل کر
پھر ہو جو موکل سے کہیں راہ میں بھیٹا
عرضی پہ ہوا [2] بسم سیاہے پہ ہوا جسیم
کاہے کی غرض عرضی ہو کاہے کا سیاہا
انصاف جو کیجے تو نہیں اس کی کچھ تقصیر

کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
دیوان بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
ہر اک متصدی سے میاں اور تپاں ہے
جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے
اور بینہ بھی موافق ہی پٹے پھر تو سماں ہے
لئے امن ہے دل کے تئیں ذی جی کو اماں ہے
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
پوچھے ہے اجی مردے ہے جی نواب کہاں ہے
ہر کوچہ میں جوں آب [1] چکا بو وہ رواں ہے
مانند کنہیا کے جہاں دیکھو تہاں ہے
پیپل کے پتوے کی طرح منہ میں زباں ہے
للچاوے موکل کو یہ کیا خوب مکاں ہے
اور زر کے اجالے کی بھی روشن دکاں ہے
گھر جا کے پکارا جو کوئی لالہ کہاں ہے
آپ ہی کہا گھر میں سے کشن چند کے یہاں ہے
اسناد کا جاگیر کی یہ اس سے بیاں ہے
پروانہ میں تم پہ ہوں تصدق مری جاں ہے
کیدھر کا وہ پروانہ وہ جاگیر کہاں ہے
سب ماحصل ان باتوں کا اک ہیچ تاں ہے

[1] آب چکاب [2] یعنی عرضی پر حکم لکھ گیا یعنی منظور ہو گئی اور ریج سے سیاہا جاری ہو گیا

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
مشتاقِ ملاقات اُٹھو نکا کس و ناکس
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جاکے دوگانا
تا پانچ تولہ کی رہے آٹھ پہر فکر
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
مُلّائی اگر کیجیے تو مُلّا کی ہے یہ قدر
اور حضرتِ آخوند کا اب کیا میں بتاؤں
دن کو تو وہ سیپارہ پڑھا یا کریں لڑکے
تسبیح پہ یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کی
بھاگے یہ عمل کر جو وہ شیطان کا لشکر
اب کیجیے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات
جس روز سے کاتب کا لکھا حال میں تب سے
وہ بیت ٹکے سیکڑہ لکھنے کو ہے محتاج
یہ بھی میں تکلف ہی سے کہتا ہوں وگرنہ
لکھا ہو جو ہوتی[1] کا زمانے میں نئے سر
ہدیہ ہو سوا پانچ ٹکے گزری میں آکر
دمڑی کو کتابت لکھیں دھیلے کو قبالہ
بیاہے جو کوئی شیخ بیٹے بہر فراغت
دیتا ہے دُہم خر سے کوئی شُتلہ کو نسبت

دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
ملنا اُنھیں اُس سے جو فلاں ابنِ فلاں ہے
نیت قطعِ تہنیتِ خانِ زماں ہے
گر رحم میں بیگم کے بنے نطفۂ خاں ہے
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے
ہوں دو روپیہ اس کے جو کوئی شوخی خاں ہے
تا ب کا سہ دالِ عدس جو کی دو ناں ہے
سب خرچ لکھے گھر کا اگر سہ دماں ہے
لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے
دیوالی کو لے ہاتھ لنا قب میں رواں ہے
آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے
ہر صفحہ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے
خوبی میں خط اب جس کا یہ از خطِ بتاں ہے
آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے
خطاط کی اتنی بھی رہی قدر کہاں ہے
یاقوت[2] پکارے جو بکاؤ یہ قرآں ہے
بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے
چھٹتے ہی تو شعرا کا وہ مطعونِ زباں ہے
گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

[1] خوش نویس کا نام - [2] یاقوت رقم

اور اُس کو جو دیکھے کوئی وہ بہر معیشت — اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زماں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اُٹھ کر — ہے آج کدھر عُرس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی — لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب ہوا وجد — کوئی کودے کوئی روئے کوئی نعرہ زناں ہے
گر تال سے پڑتا ہے قدم تو بھی ہنس ہنس — کہتے ہیں کوئی حال ہے یا رقص زناں ہے
اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو — ڈالا ہوا اس دال نخود قلیہ و ناں ہے
سب بیٹوں کو تجکر جو کوئی ہو متوکل — جورو تو یہ سمجھے ہے کہ کھٹو یہ میاں ہے
اور بیٹے کے دل کو ہے خرافت کا تیقن — بیٹی کو جنوں ہونے کا بابا کے گماں ہے
جب دیکھا کہ اب لڑکے لگے بھوک سے مرنے — ہر خان و خوانین کے ہمراہ دواں ہے
جب راہ خدا اپنے نکالے کوئی نواب — تب اُن کی سفارش پہ لئے رقعہ رواں ہے
مضمون ہے یہی رقعہ کا کچھ دیجئے اس کو — مداح اماموں کا ہے اور مرثیہ خواں ہے
بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری — یہ شکل بھی بات سمجھو تو راحت جاں ہے
تاک دیکھ لے منصور علی خان کا احوال — چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے
آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال — جمعیت خاطر کسی صورت سے کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام — عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سوا اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے — یہ بات بھی گوینده ہی کا محض گماں ہے

یاں فکر معیشت ہے وہاں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

ایضاً

باغِ دہلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر — نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل پت جھڑ ہوئے اور سوکھی پڑی ہیں روشیں — خاک اُڑاتی ہیں ہر اک طرف پڑا ہے خس و خار
مسکراتا تھا جہاں غنچہ و گل ہنستا تھا — اشکِ شبنم کے بھی قطرہ کے نہیں واں آثار
جس جگہ جلوہ نما ہوتے تھے سرو و شمشاد — مشت پرِ قمری کے اس جا نظر آئے یک بار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی ہی اک شاخ اوپر — عندلیبِ یک ہے بے بال و پر و دل افگار
بہ ہم سرد و بصد حسرت و صد سوزِ جگر — دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے با نالۂ زار

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تمام شد
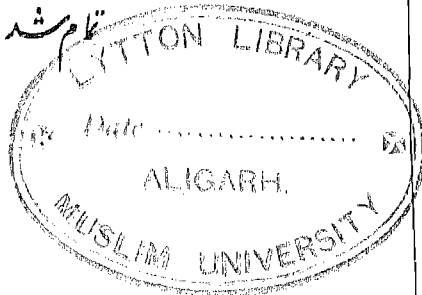
صحت نامہ اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۱۷	جائے افسوس	ہائے افسوس
۵	۱	کھول حال	کہوں حال
"	۱۱	یاد خزاں	باد خزاں
"	۱۵	جور فلک	جورِ فلک
۶	۳	سچ تو بتا	سچ تو بتا
"	۱۲	ہوا	نہ ہوا
۱۱	۱	نہ نشان	نہ شان
۱۴	۲	نہ چھوئے	نہ چھوڑے
۲۱	۱۴	نہ مٹاٹا	نہ مٹانا
۲۴	۱۱	کانوں پہ	کانٹوں پہ
۲۵	۱۴	اٹھاس	اٹھائیں
۲۶	۱۸	کہو ہیں	چھوئیں جو
۲۸	۱۲	الگ ہی	ایک ہی
۳۴	۱	سے پہلے (ایضاً) نہیں لکھا ہے	(ایضاً) ہونا چاہیئے
۳۴	۱۳	صنمان دہلی	صفہان دہلی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۰	۹	بیان وہلی	بیان دہلی
"	۱۷	صغیر	صغیر مرحوم
۵۶	۵	ظہور الدین	ظہیر الدین
۶۱	۹	ازوال	زوال
۶۶	۱۰	نازبیناں	نازنیناں
۷۲	۷	عزوقار	عزو وقار
۸۱	۴	روزشب	روز وشب
۸۱	۱۳	فرشتول	فرشتوں
۸۱	۱۴	چاندنی چوکِ	چاندنی چوک
۸۵	۸	" "	کوکب مرحوم جناب تفضل حسین شاگرد غالب مرحوم دہلوی
۱۰۱	۶	عشوۂ ناز	عشوۂ و ناز
۱۰۲	۱۸	وہلی	دہلی
"	"	رندیاں	رنڈیاں
۱۱۶	۵	رودن	رودون